THE SINLESSNESS OF CHRIST

بیگناہی مسیح

مؤلفہ

پادری ہوپر صاحب سابق پرنسپل سینٹ جانز ڈوینٹی سکول لاہور

جس کے

اکثر مطالب پروفیسر اُلمن صاحب کی اسی مضمون کی کتاب



سے لئے گئے ہیں

۱۹۰۱ء

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی - لاہور



فہرستِ مضامین

ابواب	مضمون	صفحہ
۱	مسیح کی بیگناہی کا عقیدہ دینِ مسیحی کے واسطے ضرور ہے۔	۱
۲	بے گناہی کی ماہیّت۔	۳
۳	بے گناہی کے خیال کے موجود ہونے سے مسیح کی بیگناہی ثابت ہے۔	۵
۴	مسیح کی بیگناہی مسیحیوں کی نیکی سے ثابت ہے۔	۱۲
۵	مسیح کے ہمعصروں کی گواہی۔	۱۶
۶	انجیل کی گواہی۔	۲۲
۷	خود مسیح کی گواہی۔	۲۸
۸	اُن اعتراضوں کے جواب جو مسیح کی بیگناہی کے امکان پر کیے گئے ہیں	۳۲
۹	اُن اعتراضوں کا جواب جو انجیل کی گواہی پر کیے گئے ہیں۔	۴۰
۱۰	اُن اعتراضوں کے جواب جو مسیح کے بعض افعال و اقوال پر کیے گئے ہیں	۴۲
۱۱	مسیح کی بیگناہی کے نتائج۔	۴۸
۱۲	مسیح کی بیگناہی کے عقیدہ کی تواریخ۔	۵۹



مسیح کی بیگناہی کا بیان

پہلا باب

مسیح کی بیگناہی کا عقیدہ دینِ مسیحی کیواسطے ضرور ہے

جیسا مسیحی دین اپنے بانی پر موقوف ہے ویسا اَور کوئی مذہب اپنے بانی پر موقوف نہیں۔ اس سبب سے اُس کے بانی کی بیگناہی ثابت کرنی اَور سب مذہبوں کے بانیوں کی بیگناہی ثابت کرنے سے نہایت ہی زیادہ ضرور ہے۔ ہندو مذہب کا بانی تو کوئی ہے نہیں۔ رہے رِشی اور مُنی سو اگر اُن کے چال چلن کا حال ٹھیک ٹھیک معلوم بھی ہوتا تو بھی ہندو مذہب کی خوبی یا بُرائی اُس سے ثابت نہ ہوتی۔ بودھ لوگ اس سے نو بہت خوش ہو سکتے ہیں کہ ہمارا ساکی مُنی ایسا نیک اور حلیم اور نرم دل آدمی تھا۔ مگر وہ یہہ کبھی خیال نہیں کرتے کہ ہمارے مذہب کی سچائی اِس بات پر موقوف ہے۔ اگر کوئی راجا رام موہن رائے یا بابو کیشب چندر سین پر عیب لگاتا تو البتہ برہمو لوگ برا مانتے لیکن

اِن میں عیب ثابت ہونے پر بھی اُن کا ایمان نہیں جاتا رہتا۔ محمد صاحب کی بے رحمی اور شہوت پرستی سے البتّہ یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا شخص حقیقت میں خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر صرف یہی دلیل ہوتی تو شاید اسلام کے رد کرنے کے لئے کافی نہ سمجھی جاتی۔ چنانچہ ہزاروں مسلمانوں کے خیالوں میں یہہ بات اسلام کے باطل ہونے کے لئے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی ہے ۔

حضرت موسیٰ کا مزاج اور چال چلن البتہ بہت غور کے ساتھ پڑھنے اور کوشش کے ساتھ پیروی کرنے کے لائق ہے۔ مگر اِس بات پر اُن کی شریعت کی سچائی موقوف نہیں سمجھی جاتی کیونکہ وہ جو ایک خاص موقع پر گناہ میں پڑے اِس سے نہ بائبل میں اُن کی جاری کی ہوئی شریعت کی نسبت کبھی شک ہوا اور نہ یہودیوں کے خیالوں میں۔ لیکن مسیحی دین کا حال بالکل اَور ہے۔ مسیحی دین کی ماہیّت نہ کوئی عقیدہ ہے اور نہ چال چلن یا عبادت کے قواعد ہیں بلکہ ایک شخص کے ساتھ مقاربت رکھنی اور اس کے سبب زندہ ہونا اور اُس کے لئے زندگی گذارنی ہے۔ اور یہہ شخص اُس دین کا بانی ہے۔ اُس کا بانی اس کی بنا بھی ہے۔ وہ نہ صرف اس کا جاری کرنے والا ہے بلکہ اس کا چشمہ اور اس کا مقصد بھی ہے۔ وُہی نجات دہندہ ہے اور وُہی منصف ہے جس کا ذکر اس دین میں ہے۔ اس سبب سے مسیحی دین اپنے بانی کی کیفیت پر بالکل موقوف ہے۔ ساکی مُنی یا موسیٰ یا رام موہن رائے

گنہگار ثابت ہوں تو ہوں اس سے اُن کے مذہبوں کا کچھ نقصان نہ ہوگا لیکن اگر یسوع مسیح گنہگار ثابت ہو تو اس کا دین بالکل جڑ سے اُکھڑ جائیگا اور جتنا وہ دعویٰ کرے وہ بالکل باطل ہوگا بلکہ سُننے کے بھی قابل نہ ہوگا کیونکہ اَور سب مذہبوں کے بانی آئے سکھاتے رہے اور چلے گئے لیکن یسوع مسیح اپنے دین کے عقیدے کے موافق جیتا ہے اور اپنے سب پیروؤں کے ایمان اور اُمید کا ملجا و ماوا ہے اور پھر آکر سب آدمیوں کی عدالت خاص کراسی مُقدّمہ میں کریگا کہ وہ اس سے کیا علاقہ رکھتے ہیں اور اُس کے نزدیک کیسے ٹھہرتے ہیں ۔

دوسرا باب

بیگناہی کی ماہیّت

بیگناہی سے یہ مُراد نہیں ہے کہ گناہ کرنا ممکن نہ ہو۔ بلکہ جہاں گناہ کا امکان ہے صرف وہیں بیگناہی کا ذکر ہو سکتا ہے۔ خدا بیگناہ نہیں کہلاتا اس واسطے کہ وہ بدی سے بالکل الگ ہے اور بدی کے باب میں کوئی اُس کی آزمائش بھی نہیں کر سکتا لیکن آدمی میں بالذات گناہ کا امکان ہے اور اس واسطے اُس میں بیگناہی کا بھی امکان ہے جو آدمی باوجود اُن ترغیبوں کے گناہ نہیں کرتا جن کے سبب اکثر لوگ گناہ میں پڑ جاتے ہیں وہ بیگناہ ٹھہرتا ہے ۔

اگرچہ لفظ بیگناہی بصورت نفی ہے مگر پھر بھی بیگناہی کی صفت محض نفی نہیں ہے اور جہاں محض نفی مقصود ہو وہاں لفظ بےعیبی کا استعمال بہتر ہو گا۔ لیکن جس شخص میں گناہ نہیں ہے اُس میں وہ حقیقت ہونی چاہیئے جو گناہ کے برخلاف ہے یعنے جو گناہ سے آزاد ہے وہ راستبازی کا تابعدار ہو گا۔ اگر فرض کیا جائے کہ آدم کی پیدائش کے وقت بیگناہی محض صفت نفی تھی تاہم اس وقت کہ دُنیا خراب ہو گئی ہے اور گناہ اُس میں حکومت کرتا ہے بیگناہی محض صفت نفی نہیں ہو سکتی۔ اب بیگناہی کے واسطے صرف گناہ سے محفوظ رہنا کافی نہیں ہے بلکہ گناہ سے سخت اور متواتر مخالفت رکھنی بھی لازم ہے اور یہ مخالفت خالص معصوموں کا کام نہیں بلکہ ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے دل راستبازی اور پاکی کے محکوم ہو گئے ہیں ۔

پس چونکہ گناہ شریعت کی مخالفت ٹھہری ہے اس لئے بیگناہی شریعت کے سارے احکام کی پوری تابعداری ہے خواہ اندرونی خواہ بیرونی فعلوں یا حالتوں سے منسوب ہوں۔ دوسرے چونکہ گناہ خدا کی نافرمانی ہے اس لئے بیگناہی کامل دینداری اور خدا کی فرمانبرداری ہو گی۔ تیسرے چونکہ گناہ خدا کی محبّت کو چھوڑنا اور خودغرض رہنا ہے اس لئے بیگناہی یہ ہو گی کہ خدا سے کامل محبّت رکھی جائے اور انسان کی ذات اور اس کے افعال بالکل اُسکی اطاعت میں صرف ہوں ۔

مسیح کی بیگناہی واقعی اسی طرح کی ہے ۔

اس عقیدہ کا ثبوت اس طرح نہیں ہو سکتا جس طرح علم ریاضی کے نتیجوں کا ہوتا ہے یعنی ایسا ثابت نہیں ہوتا کہ خواہ مخواہ ہر ایک شخص کی عقل اُس کو بالضرور مان لے۔ بلکہ کوئی دینی عقیدہ بھی اِس طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ جہاں شک کی جگہ نہیں وہاں ایمان کی بھی ضرورت نہیں سارے نیک شخصوں کی نیکی سے انکار کرنا ممکن ہے۔ اور اگر کوئی نیک کام سب پر روشن بھی ہو۔ تاہم جس غرض سے وہ کیا گیا اُس کے نیک ہونے سے انکار کرنا ممکن ہے۔ اور یہی مسیح کی بھی بیگناہی کا حال ہے اِس کے ماننے کے واسطے یہہ ضرور ہے کہ ہم بھی بیگناہی کی طرف مائل اور اُس کے مشتاق ہوں۔ کیونکہ اسی طرح سے ہم مسیح کے گویا یکدل ہو کر اُس کے خیالات اور افعال اور کلمات بخوبی سمجھ سکینگے ॰

تیسرا باب

بیگناہی کے خیال کے موجود ہونے سے مسیح کی بیگناہی ثابت ہے

دو واقعات ہیں جن کو ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا چاہئیے۔

ایک تو یہہ کہ جب سے مسیحی دین دُنیا میں پھیلنے لگا اور جہاں تک وہ دُنیا میں پھیلا ہوا ہے اُس وقت سے اور وہاں تک یعنی مسیح کے سب پیرؤوں میں بیگناہی کا خیال اِس طرح پھیلا ہوا ہے کہ اُن کے دلوں میں بھی بہت ہی ہوتا ہے اور اُن کی زبانوں پہ بھی بیگناہی کا لفظ بہت آتا ہے۔ سب مسیحی لوگ

دو باتوں میں بالکل متفق ہیں اور متفق بھی ایسے کہ گویا از خود ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارا مرشد جب زمین پر تھا تو بیگناہ تھا۔ دوسرے یہہ کہ جس نجات کے ہم آرزومند اور اُمّیدوار ہیں اُسکی خاص خوبی یہ ہوگی کہ ہم بیگناہ ہوں اور ان دونوں باتوں کو ابتداہی سے تمام قوموں اور ملکوں کے مسیحی لوگ کامل یقین کے ساتھ مانتے رہے ہیں ۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مسیحی دین کے پیدا ہونے سے پیشتر اور اُسکے کسی خاص ملک میں پھیلنے سے پہلے بیگناہی کا خیال دنیا میں یا ایسے خاص ملک میں نہایت ہی کم تھا اور جہاں وہ خیال تھا وہاں بھی یہ خیال نہ تھا کہ کوئی آدمی بیگناہ ہے یا پہلے کبھی تھا۔ بلکہ بیگناہ ہونے کے امکان میں بھی شک ہوتا تھا۔ ہاں البتہ یشعیاہ کے ۵۳-۹ میں لکھا ہے کہ " اُس نے کسی طرح کا ظلم نہیں کیا اور اس کے منہ میں ہرگز چھل نہ تھا" اور چونکہ سب طرح کے گناہ یا تو جبر کے سبب سے ہوتے ہیں یا فریب کے سبب سے۔ اس لئے اس آئت سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ جس کا ذکر اُس میں ہے وہ بیگناہ تھا۔ لیکن یہ آئت خاص الہام سے لکھی گئی ہے۔ اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ ایسا خیال از خود بنی اسرائیل کے دلوں میں کبھی پیدا ہوا ہو۔ برعکس اس کے یہ آئت اُسی مسیح کی نسبت پیشگوئی ہے جسکی بیگناہی ہم ثابت کرنی چاہتے ہیں ۔

اب یہ دریافت کرنا ہوگا کہ یونانیوں اور رومیوں میں یہ خیال کس قدر اور کس طرح کا تھا یونانی لفظ اَن مارتیت (بیگناہ) اور اَن مارتیسیا (بیگناہی)

بہت پُرانے تو ہیں لیکن اِن کے معنی صرف ستوئیک فیلسوفوں میں ٹھیک بیگناہ اور بیگناہی ٹھیرے ہیں۔ اس فرقے سے پہلے ان لفظوں کے معنی کہیں غلطی سے آزاد۔ کہیں قرض سے آزاد۔ کہیں پاکدامن کہیں کوئی اور ظاہری بےعیبی کے تھے جن میں گناہ کا حقیقی خیال نہیں آتا تھا ستوئیک فیلسوفوں میں البتہ ان لفظوں کے معنی ہمارے مطلب کے بہت نزدیک لئے گئے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ یہ معنی مسیح سے پیشتر مستعمل نہ تھے بلکہ صرف ایپکٹیٹس کی تصنیفات میں پائے جاتے ہیں اور یہ شخص پہلی صدی کے آخر میں روما میں رہتا تھا اور اس وقت مسیحی دین نے روما کے باشندوں میں بڑی تاثیر کی تھی۔ پھر دیؔ اُگنیتیس لائرتیس نے اپنی کتاب میں اِن لفظوں کا اس معنی میں استعمال کیا اور یہ مصنّف تیسری صدی کے شروع میں گذرا ہے ۔

لیکن اِن لفظوں سے قطع نظر کرکے ہمیں بیگناہی کے خیال کا بیان کرنا چاہئیے ۔

۱۔ افلاطون نے اپنی کتاب "سلطنت جمہوری"

افلاطون کی کتاب میں راستباز آدمی کی تعریف

کے ایک مشہور مقام میں راستباز آدمی کی اِس طرح تعریف کی ہے کہ "وہ لوگوں کی نظروں میں نیک ہونا نہیں چاہتا بلکہ فی الحقیقت نیک ہونا چاہتا ہے اور اُس کی راستبازی اُسی حال میں حقیقی ثابت ہوگی جب کہ وہ دُنیا میں ناراست معلوم ہو۔ اور اس سبب سے وہ بہت ستایا جائیگا اور نہائت دُکھ پاکر

آخر پھانسی دیا جائیگا لیکن وہ مرتے دم تک اپنی راستبازی پر قائم رہیگا"
مگر اس بیان میں دو نقص ہیں ایک تو یہ کہ ایک ہی طرح کی بیگناہی یعنی راستبازی کا ذکر ہے دوسرے یہ کہ یہ تمام بیان محض خیالی ہے یعنی افلاطون نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ایسا راستباز آدمی کبھی تھا یا ہے یا ہوگا +

سقراط کی سیرت

۲- اگر یونانیوں میں کوئی آدمی بیگناہ تھا تو سقراط تھا- اور کسنفون نے جو ایک مشہور مؤرخ گذرا ہے اُس کی سیرت کے بیان میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس کی نسبت یہ لکھتا ہے کہ کسی نے کبھی سقراط کو کوئی بے دینی یا بے ایمانی کا کام کرتے نہیں دیکھا اور نہ اُس کے مُنہ سے ایسی بات سُنی- لیکن ایک تو کسنفون کی کتاب کی صحت میں بہت علما شک کرتے ہیں- دوسرے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں سقراط کے اُسی سلوک کا ذکر ہے جو وہ اپنے شہر والوں سے برملا رکھتا تھا تیسرے سقراط کی کوئی گواہی جو اس نے اپنی نسبت دی ہو موجود نہیں- بلکہ وہ جو ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ وائمن[1] مجھے سمجھاتا ہے کہ فلاں فلاں کام مت کر اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے تئیں بدی کی طرف مائل جانتا تھا +

سیسرو کا خیال

۳- سیسرو جو مسیح سے پیشتر پچھلی صدی میں گزرا ہے افلاطون اور سقراط کے برابر تو فلاسفر نہ تھا- مگر اُس نے اپنے سے پیشتر کے سب فیلسوفوں کی کتابیں دیکھ کر اُن کے

---

[1] یوں سمجھنا چاہئے کہ یونانی میں اکثر یہ لفظ بجائے فرشتے کے مستعمل ہوتا تھا +

مطالب پر بخوبی غور کی تھی۔ اُس نے اپنی ایک کتاب ٹسکیولن ڈسپیوٹیشن میں لکھا ہے کہ "کامل درجہ کا دانا آدمی میں نے تو کبھی نہیں دیکھا لیکن اگر فیلسوفوں کا یہ دعوےٰ ہے کہ ایسا آدمی کسی زمانہ میں ہوگا۔ تو اُن کو یہ بتانا چاہئے کہ وہ کس قسم کا شخص ہوگا"۔ یہاں دانا سے مُراد وہ آدمی ہے جو اپنی سب خواہشوں کو ضبط کر سکے اور اس مقام پر خاص اُسی کا ذکر ہے جو درد کی کامل طور پر برداشت کر سکے۔ کیونکہ سب قوموں میں خاصکر رومی لوگ اور سب فرقوں میں سے خاصکر ستوئک فرقے کے لوگ اس بات کو بڑا کمال سمجھتے تھے۔ پس جب سیسرو اس محدود کمال کے امکان میں شک کرتا تھا تو پورے کمال کا کیا ذکر۔

اپِکٹیٹس کا خیال

۴۔ اپِکٹیٹس جس کے خیال ایسے عمدہ ہیں کہ خواہ مخواہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی دین کی اُس میں کچھ تاثیر ہوئی ہوگی۔ وہ ایک مقام پر کہتا ہے کہ "فیلسوف کا یہ مقصد اور ارادہ ہے (یعنی یہ اس پر فرض ہے) کہ بیگناہ ہو جائے"۔ اور دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "پس کیا بیگناہ ہونا ممکن ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی ممکن ہے کہ ہم برابر بیگناہی کے واسطے کوشش کرتے رہیں"۔

اپلونیس کے بارے میں

۵۔ فلسٹراٹس نے جو دوسری صدی کے آخری نصف میں گزرا ہے اپلونیس تیوانی کی سیرت کا بیان ایک کتاب میں لکھا ہے جس میں اُس کو کامل آدمی کر کے بیان کیا ہے۔ اپلونیس مسیح کا کسی قدر ہمعصر تھا۔ لیکن

اَپل لُونِیُس کے مرنے کے بعد تقریبًا سو برس تک اُس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا اِس سبب سے اُس کی نسبت فِلسٹراٹس کی رائے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اَپل لُونِیُس اُن جادوگروں اور شعبدہ بازوں میں سے تھا جو اس وقت تمام رومی سلطنت میں کثرت سے تھے اور چونکہ فِلسٹراٹس نے بادشاہ کی بیوی جُولیا کے حکم سے جو اُس کی مُربّی تھی اور جس کی نسبت تحقیق ہُوا ہے کہ ہر طرح کی باتوں کو تسلیم کر لیتی تھی یہ کتاب لکھی۔ اس لئے غالب ہے کہ اُس نے اَپل لونیُس کے افعال اور احوال کو بہت بڑھا کر لکھا ہوگا۔ پیچھے تو بعض غیر مذہب کے عُلما مسیح سے اُس کا مقابلہ کرنے لگے لیکن اگر وہ فی الحقیقت کوئی مشہور آدمی ہوتا تو اُس کے ہمعصروں میں بھی اُس کا کچھ ذکر پایا جاتا۔

ایشیائی کتابوں کی رائے

ان مثالوں کے سوا تمام رومی اور یونانی غیر مذہب کی کتابوں میں بیگناہی کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ ایشیا کے ملکوں کی کتابوں میں اگرچہ کسی نے اب تک ایسی چھان بین نہیں کی کہ جن مقامات میں بیگناہی کا ذکر ہے ان کا مقابلہ کیا جاتا۔ لیکن یقین ہے کہ اگر کوئی ایسا کرے بھی تو ایسا ہی نتیجہ نکلیگا جیسا کہ رومی اور یونانی کتابوں کی تحقیقات سے نکلا ہے۔

اچھّا اب مذکورۂ بالا دونوں واقعات کو (صفحہ ۵ و ۶ دیکھو) جن میں کچھ شک نہیں ہے ایک دوسرے سے مقابلہ کریں تو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ دنیا کی تواریخ کے ایک خاص زمانے تک بیگناہی کے خیال کا ذکر بہت ہی

کم پایا جاتا ہے۔ اور دینی ہادیوں نے بھی واقعی بیگناہی کو ایک ناممکن سی بات قرار دیا ہے۔ مگر اس زمانے کے بعد بیگناہی کا خیال کروڑوں آدمیوں کے کلام اور کتابوں میں دیکھا جاتا ہے اور نہ صرف بیگناہی کا خیال ہی ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس بات کا یقین بھی کہ بیگناہی دنیا میں ظاہر ہو چکی ہے اور اپنے بیگناہ ہو جانے کی پختہ اُمید بھی لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ ایسی بڑی تبدیلی کا سبب آخر کیا ہو سکتا ہے؟ صرف یہی کہ فی الحقیقت ایک بیگناہ آدمی اُس زمانے میں گذرا ہے۔ البتہ بہت سے عجیب عجیب خیال دُنیا میں پیدا ہوئے اور بہت دن تک قائم بھی رہے ہیں لیکن کبھی اور کوئی ایسا خیال دُنیا میں پیدا نہیں ہوا جو پیدا ہونے کے وقت ایسا نیا ہوا ور اتنی اور ایسی متفرق قوموں میں جاری اور اتنی مدت تک قائم اور اتنی سرگرمی اور پورے یقین کے ساتھ باقی رہا ہو جیسا کہ یہ بیگناہی کا خیال ہے۔ اگر یہ خیال پہلے سے موجود ہوتا تو البتہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ حواریوں نے اپنے دل سے بنا کر اس کے وقوع میں آنے کا فرضی بیان کر دیا اور اگر یہ خیال کثرت سے جاری ہوتا تو ممکن تھا کہ بہت سے لوگ اِس بیان کو یقین کر لیتے۔ لیکن چونکہ واقعی حال ایسا ہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس وقت مسیحی دین پھیلنے لگا ہے ٹھیک اُسی زمانے میں ایک بیگناہ آدمی اِس دُنیا میں گزرا ہوگا اور اُسی کی بیگناہی کے سبب بیگناہی کے خیال نے یکلخت دنیا میں ایسا زور پکڑ لیا اور جب یہ بات ثابت ہو چکی تو یہ کہنا کہ یہ بیگناہ آدمی کون تھا تحصیل حاصل ہے۔

چوتھا باب

مسیح کی بیگناہی مسیحیوں کی نیکی سے ثابت ہے

مسیحی لوگ جو اس بات میں متفق ہیں کہ مسیح بیگناہ ہے اِس میں بھی متفق ہیں کہ ہم بیگناہ نہیں ہیں بلکہ ہم سے یہی ہو سکتا ہے کہ بیگناہی کی حالت کے امّید وار ہو کر ہمیشہ اس منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتے ہیں مگر پھر بھی جیسا وہ اس کو بالکلیہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں ویسا ہی اُس کو اپنی رائے میں کم و بیش پا بھی چکے ہیں اور اگر اس کو کچھ بھی نہ پاتے تو اپنے تئیں حقیقتاً مسیحی نہ سمجھتے۔ یہ بھی مخفی نہ رہے کہ نیکی کی نسبت مسیحیوں اور اَور لوگوں کے خیالوں میں دو طرح کے اختلاف ہیں جن کا اس باب میں ذکر کیا جاتا ہے۔

اول یہ کہ اَور لوگ نیکی کو شریعت کے فرائض کی صرف ظاہری تابعداری سمجھتے ہیں اور اگر نیکی میں اُن فرائض کی باطنی تابعداری بھی شامل کریں تو یہ باطنی تابعداری ایسی ہو گی جو صرف دل کے الگ الگ افعال پر مبنی ہے۔ لیکن مسیحی لوگ انسانی نیکی کی اصل دل کی تبدیلی کو سمجھتے ہیں یعنی آدمی کی طبیعت خودی سے پھر کر نیکی کی طرف متوجہ ہو۔ مسیحی لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ توبہ یعنے تبدیل نیت اور نئی پیدائش۔ اور نئی انسانیت حقیقی نیکی کی ضروری شرطیں ہیں۔ لیکن جہاں مسیحی دین کی تاثیر نہیں ہوئی وہاں ایسے الفاظ کم پائے جاتے ہیں۔ اور اگر کہیں پائے بھی جائیں تو ان کے

یعنی ان دونوں میں سے ایک ہونگے - اوّل یہ کہ کسی فرقے کے ساتھ شریک ہونا اور اُس کے تمام حقوق کا مستحق ہونا - چنانچہ برہمن چھتری ویش جنیؤ کو پہن کر دوِج (یعنی دوبارا پیدا ہؤا) کہلاتے ہیں - دوسرے یہ کہ صرف رایوں کی تبدیلی چنانچہ افلاطون پیرِس ترفا یعنے بدی سے گھومنے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آدمی کی پیرِس ترفا سیب کے کھانے سے بہت مشکل ہے" مگر اسکے ہاں اِس گھومنے کے اصل معنے یہ لئے گئے ہیں کہ غلطی سے حق کیطرف پھرنا - اِس لئے وہ بےعقل آدمیوں کی پیرِس ترفا کو نکمّا جانتا ہے ؞

اِس کے برعکس مسیحی لوگ سمجھتے ہیں کہ نیکی حاصل کرنے کے لئے ہمارے دلوں میں ایک طرح کی تاثیر ہوتی ہے جو ہماری کسی فطرتی قوّت سے نہیں ہُوئی اور نہ کسی ایسی قوّت پر موقوف ہے - اور وہ اس نئی تاثیر کو گناہ سے آزاد سمجھتے ہیں یعنے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اِس میں تو گناہ کا نام تک نہیں ہے اور ہم جو گناہ کرتے ہیں وہ اِس سبب سے کرتے ہیں کہ اس وقت تک نئی تاثیر ہمارے دلوں پر بالکل غالب نہیں آتی اور گناہ بھی اسی قدر کرتے ہیں جس قدر یہ غالب نہیں آئی - پس یہ خیال کس طرح پیدا ہؤا ہوگا؟ البتہ اس کا ایک سبب تو مسیح کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ اُس نے اِس بات پر بہت تاکید کی لیکن یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ محض اُس کی تعلیم سے نیکی کی نسبت ایسا بالکل نیا خیال نہ صرف دنیا میں پیدا ہو گیا ہو بلکہ مسیح کے سب پیروؤں میں جاری بھی ہو گیا ہو اور اب تک اُن کے دلوں پر غالب ہو - ہاں اگر یہ نیا خیال

ایسا ہوتا جس سے نیکی بہت آسان معلوم ہوتی تو شاید اس کا اس طرح جاری ہونا ممکن ہوتا۔ لیکن اس خیال سے جو مسیحی لوگ رکھتے ہیں نیکی کا حاصل کرنا بہت ہی مشکل ٹھیرا اور نیکی کا یہ مسیحی خیال انسان کے غرور کے لئے بھی ایک ایسا بڑا تازیانہ ہؤا کہ لوگ بے ضرورت اس کی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ پس اس خیال کے غالب آنے کا کوئی نہ کوئی کافی سبب تلاش کرنا چاہئے۔ اس کے سوا اور کونسا ایسا سبب ہوگا کہ جنہوں نے پہلے اس خیال کو قبول کیا انہوں نے سمجھا کہ وہ بیگناہی جو تخم کے طور پر ہر ایک مسیحی میں موجود ہے کسی نہ کسی آدمی سے برملا ظہور میں آئی ہے اور وہ نئی انسانیت جو ہر ایک مسیحی کی رُوح کے اندر چھپی ہوئی ہے کسی نہ کسی آدمی کی کامل انسانیت ہو کر اس کے تمام افعال اور احوال سے ظاہر ہوئی ہے اور جب انہوں نے یہ سمجھا ہو تو اس کے سوا کہ فی الحقیقت ایسا ہی وقوع میں آیا تھا اُن کے یہ سمجھنے کا اَور کونسا کافی سبب ہوگا۔

پھر یہ بھی خیال کریں کہ مسیحیوں کے نزدیک یہ نئی انسانیت جو حقیقی نیکی کی اصل ہے اور خود گناہ سے پاک ہے فی الحقیقت مسیح ہی کی تاثیر ہے۔ پولس کہتا ہے کہ "میں تو زندہ نہیں ہوں لیکن مسیح مجھ میں زندہ ہے" لیکن اگر مسیح خود بیگناہ نہیں ہے تو کس طرح وہ بیگناہی کی بنا اور اس کا بانی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ گنہگاری سے بیگناہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور ادنیٰ اعلیٰ کا ماخذ نہیں بن سکتا۔ یہ دلیل اَوروں کو تو شاید کمزور معلوم ہو لیکن مسیحیوں کے لئے اس سے زیادہ پختہ ثبوت غیر ممکن ہے۔ بلکہ یہی امر اس بات

کا سبب ہوگا کہ وہ گویا از خود مسیح کی بیگناہی کو مانتے ہیں جو اپنے بیں ایسی تاثیر دیکھتے ہیں کہ گناہ سے آزاد ہو وہ جانتے ہیں کہ تاثیر کرنے والا بھی بے گناہ ہے ❖

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ نیکی کے اُس خیال میں جو مسیحی لوگ رکھتے ہیں دینداریٔ[۱] اور راستبازی دو نو برابر ملی ہوئی ہیں یہاں تک کہ دونو گویا ایک ہوگئی ہیں یہ تو صاف ظاہر ہے کہ سب لوگ کم و بیش یہ جانتے ہیں کہ دینداری اور راستبازی دونوں میں کچھ نہ کچھ علاقہ ہے مثلاً جو کوئی اپنے دل کی گواہی کو سُنتا ہے وہ جانتا ہے کہ انصاف اور پرہیزگاری خدا کا حکم ہے۔ مگر پھر بھی جہاں مسیحی دین کی تاثیر نہیں ہوئی بلکہ جہاں کہیں وہ دل سے مقبول نہیں ہؤا وہاں بھی یہ دونوں باتیں کم و بیش الگ الگ رہتی ہیں۔ یوروپ میں اکثر راستبازی دینداری سے سبقت لیگئی ہے اور اُس کے برعکس ایشیا میں بُودھ کے پیروؤں کے سوا اکثر دینداری راستبازی پر سبقت رکھتی ہے۔ یوروپ میں بعض اوقات کانشنس یعنی تمیز کا زیادہ خیال کرنے کے سبب سے دینداری ترک کی گئی اور اس کے برعکس ایشیا میں وقتاً فوقتاً ناراست کام دین کے نام سے کئے گئے اور کانشنس کی سندیں دینداری سے دب گئیں ❖

---

[۱] نیکی دو حصّوں میں تقسیم کیگئی ہے ایک دینداری یعنی وہ نیکی جو خاص خدا کے ساتھ علاقہ رکھتی ہے دوسرے راستبازی یعنی وہ نیکی جو خاص انسان کے ساتھ علاقہ رکھتی ہے مثلاً انصاف یا پرہیزگاری۔ یہ ایسی ہی تقسیم ہے جیسے مسلمانوں کے ہاں عبادات و معاملات ❖

مسیحی دین اِن دو نقصوں سے پاک ہے۔ وہ دونو طرح کی نیکی کو ملا دیتا ہے اور ان کے آپس میں ملنے سے ایک کو دوسرے کے نزدیکی اور علاقہ کے ذریعے بڑی مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ اس امر کا مفصل بیان رسالہ حقیقت گناہ میں لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر ہم اتنا کہہ کر یاد دلاتے ہیں کہ مسیح کی شریعت کی جو اصلی بات ہے یعنی خدا کی محبت اور یہ دونو عقاید کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا اور اس نے اپنے بیٹے کو انسان کے لئے مرنے کے واسطے دیدیا۔ یہ تینوں چیزیں جب دل سے قبول ہوتی ہیں تو ان سے نیکی کا وہ خیال خواہ مخواہ پیدا ہوتا ہے جو صرف مسیحیوں میں پایا جاتا ہے یعنی ایسا خیال جس میں مذکورۂ بالا دونو طرح کی نیکیاں برابر شامل ہیں۔ اچھا ہندو وہ ہے جو اپنی ذات کو محفوظ رکھتا ہے اور اچھا مسلمان وہ ہے جو اپنے دین کے فرائض کو بجا لاتا ہے۔ مگر جو مسیحی صرف دینداری یعنی تقلید مذہب کے کاموں میں مشغول رہتا ہے خواہ وہ کتنی ہی درستی کے ساتھ کیوں نہ ہوں اور آدمیوں کے ساتھ ناراستی سے پیش آتا ہے وہ کبھی اچھا مسیحی نہیں کہلاتا اور اگر کہلائے بھی تو صرف ایسے ملکوں میں جہاں بائبل مروّج نہیں ہے اور نام چار کے مسیحی جب اپنے مذاہب کے ایسے شخص کو دیکھیں جو راستبازی کا پورا طالب ہو تو وہ اس کو "مسیحی" کہکر ہنستے ہیں لیکن کیا کوئی راستباز ہندو یا مسلمان بھی بطور تمسخر ہندو یا مسلمان کہا جاتا ہے؟ *

پس اس بڑے فرق کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ یہی کہ جب مسیحی دین شروع ہوا اُس وقت دینداری اور راستبازی مجموعۃً ایک آدمی سے کامل طور پر

ظاہر ہوئی اور ایک ایسا آدمی گذرا کہ نہ اس کی دینداری اس کی راستبازی سے کچھ سبقت لیگئی اور نہ اُس کی راستبازی اس کی دینداری سے۔ بلکہ دونو کامل طور پر اور ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی اس میں دکھائی دیں۔ اور مسیح کا ان صفات کے ساتھ موصوف ہونا اُس کے تمام احوال سے صاف ظاہر ہے ۔

اِس بات کا ثابت کرنا کچھ ضرور نہیں کہ دینداری ور راستبازی مجموعتہً بیگناہی کے لئے ضرور ہیں۔ اگرچہ مسیحی دین سے پیشتر کوئی شاید بیگناہی کا ایسا بیان نہیں کر سکتا تھا کہ اُس میں دینداری اور راستبازی دونو مساوی موجود ہونی چاہئیں۔ مگر اب چونکہ یہ بات ظاہر ہو گئی ہے۔ اس لئے کوئی شخص اِس سے انکار نہیں کر سکتا کہ دینداری ور راستبازی کے اس طرح جمع ہوئے بغیر بیگناہی غیر ممکن ہے۔ پس جب مسیح میں اِن کا اِس طرح جمع ہونا ثابت ہؤا تو اُس کی بیگناہی کے لئے بھی ایک بڑا ثبوت حاصل ہؤا ۔

پانچواں باب

مسیح کے ہمعصروں کی گواہی

دُنیا میں ہر ایک آدمی کے مزاج کی نسبت اُس کے ہمعصروں میں کسی نہ کسی طرح کا خیال پیدا ہوتا ہے یعنی وہ اُس کو خواہ نیک خواہ بد اور خواہ

کچھ نیک اور کچھ بد سمجھتے ہیں۔ جتنے ہمعصر یسوع ناصری سے کچھ بھی واقف تھے۔ سب اس امر میں متفق تھے کہ وہ نہایت ہی انوکھا آدمی تھا اور اُسکی مانند کوئی آدمی نہیں ہوا۔ یا اگر ہوئے تو بہت تھوڑے آدمی ہوئے۔ پس ممکن نہیں کہ ایسے آدمی کے مزاج کی نسبت اُس کے ہمعصر بہت کچھ خیال کئے بغیر رہے ہوں اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ اُن کے خیالوں پر ہم لوگوں کا استناد بجا ہے کیونکہ اُن کا ایسی بات میں دھوکا کھانا مشکل تھا۔ لیکن اُن کے خیال ہمکو کس طرح معلوم ہوں؟ اب تک تو ہم نے وہ خیالات دلیل کے طور پر پیش کئے ہیں جو اس وقت تک تمام مسیحیوں میں جاری ہیں اور جنہیں کوئی چاہے تو دریافت کرسکتا ہے۔ لیکن اب ہمکو اُن پرانی کتابوں سے ثبوت بہم پہنچانا ہوگا جن میں یسوع کے ہمعصروں کے خیال قلمبند ہیں۔ یہ اس بات کے ثابت کرنے کا موقع نہیں کہ عہدنامہ جدید کی کتابیں فی الحقیقت یسوع کے ہمعصروں کی طرف سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن چونکہ اور بہت سی کتابوں میں پختہ دلیلوں کے ساتھ ثابت ہوچکا ہے کہ عہدنامہ جدید کی سب کتابیں پہلی صدی میں لکھی گئیں ہیں اس لئے یہ امر مُسلّم تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ اچھا پھر ان کتابوں میں مسیح کی بیگناہی کی نسبت کون سی گواہی پائی جاتی ہے؟

۱۔ پہلے ہم اُن کی گواہی پر لحاظ کریں جو مسیح کے شاگردوں کے شمار میں نہیں تھے۔

(۱) پنطیُس پِلاطُس کا حال انجیل کے علاوہ اُسی زمانہ کی اور

بہت سی کتابوں میں بھی مذکور ہے - اور سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی سخت اور خودغرض اور ظالم آدمی تھا - لیکن اُس کی سُنو کہ جب یہودی لوگ مسیح کو برباد کرنا چاہتے ہیں اور بڑے غصہ سے پی لاطُس کے سامنے جمع ہو کر پکارتے ہیں کہ "اُسے صلیب دے صلیب" تو وہ بار بار اُن سے کہتا ہے کہ "میں اُس کا کوئی قصور نہیں پاتا" +

(ب) پی لاطُس کی بیگم شاید بے رحم تو نہ تھی لیکن اُس عزّت دار رومی بیوی کو ایک یہودی مرشد سے کیا واسطہ تھا - اُس کے مارے جانے کا اُسے کس واسطے فکر ہوتا؟ مگر اُس کو مسیح کی بے قصوری کا ایسا یقین ہے کہ جب وہ دیکھتی ہے کہ اُس کی جان بڑے خطرے میں پڑی ہوئی ہے تو اُس کو آرام سے نیند نہیں آتی - بلکہ غضب الٰہی کا خوف کر کے وہ عدالت گاہ میں اپنے شوہر کے پاس یہ پیغام بھیجتی ہے کہ "تو اُس راستباز آدمی سے کچھ کام نہ رکھ" +

(ج) پھر جب مسیح کی جان نکل چکی اور اُس کی لاش صلیب پر ٹنگی رہی اور اس وقت حق گوئی کے سوا اُس کی تعریف کرنے کی کوئی اور وجہ نہ تھی - تو جو سپاہی اُس کا پہرہ دے رہے تھے اُن کا صوبہ دار کیا کہتا ہے - "فی الحقیقت یہ راستباز آدمی تھا" +

(د) اُس سے کچھ پہلے جب مسیح صلیب پر زندہ تو تھا - مگر لاچار اور مرنے والا تو اُس وقت اُس ڈاکو نے جو اُس کے پاس ٹنگا ہوا تھا کیا کہا یہ کہ "اُس شخص نے کوئی بیجا کام نہیں کیا" اور اس نے یہ خیال اپنے دل

ہی میں نہیں رکھا بلکہ اپنے ساتھی کے برخلاف ظاہر بھی کیا اور اس کے علاوہ وہ اس بیقصور کو اپنا منجی سمجھ کر اُس سے اُس جہان کی نجات کی درخواست کی ۔

۲- اب مسیح کے شاگردوں کی گواہی سُنو ۔

(ا) پہلے یہوداہ اسکریوتی کی سُنو جس نے مسیح کو پکڑوایا - دیکھو اُسے مسیح کے پکڑوانے کا انعام ملا - اُس کے ہاتھ میں تیس روپے ہیں - اُنہیں وہ کیا کرتا ہے ؟ مسیح کے قاتلوں کے پاس لے جاتا ہے اور یہ کہہ کر اُن کے پاؤں پر ڈال دیتا ہے کہ "مَیں جو اُس بیقصور کے خون بہانے کا باعث ہؤا سو گنہگار ٹھہرا" پھر جب وہ اس رنج کی برداشت نہیں کر سکتا تو خودکشی کرتا ہے - اس کا کیا سبب ہے ؟ اس لئے کہ اُس کو مسیح کی بیگناہی کا یقین ہے - وہ تین برس سے برابر مسیح کے ساتھ رہا تھا پس اگر اس میں کوئی گناہ پاتا تو کیا اُس گناہ کو اپنی بیوفائی کی حجت ٹھہرا کر ذرا بھی تسلّی پذیر نہ ہوتا ۔

(ب) دوسرے اس شاگرد پطرس کی گواہی سُنو جو مسیح کے جیتے جی سب سے زیادہ اپنے خیالات کو فاش کرتا تھا - جب مسیح کی قدرت سے وہ جال جسمیں رات بھر کچھ نہ آیا تھا یک لخت مچھلیوں سے بھر گیا تو اس نے مسیح کے پاؤں پر گر کر کیا کہا ؟ یہ نہیں کہا کہ مَیں ناطاقت ہوں - مَیں ایسی قدرت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا بلکہ یہ کہا کہ "اے خداوند میرے پاس سے جا اس لئے کہ مَیں گنہگار ہوں" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے

کہ مسیح کی نہائت پاکی کا جلال پطرس کے دل میں ایسا بھر گیا تھا کہ وہ اپنے تئیں اُس سے کچھ بھی علاقہ رکھنے کے لائق نہ سمجھا +

(ج) پھر مسیح کے اِس جہان سے جانے کے بعد وہی پطرس یہودیوں کے اُن حاکموں کے سامنے کھڑے ہو کر جنہوں نے مسیح کے قتل کا حکم دیا تھا کہتا ہے کہ "وُہ القدّوس اور الصادق" ہے (اعمال ۳-۱۴) اور اپنے خط میں اُسے "بے داغ اور بے عیب برّہ" لکھتا ہے (۱ پطرس ۱-۱۹) اور یہ بھی کہتا ہے کہ "نہ اُس نے گناہ کیا اور نہ اُس کے منہ سے کوئی مکر کی بات نکلی"۔ (۱ پطرس ۲-۲۲) اور یہ بھی کہ "اُس راستباز نے ناراستوں کے لئے دُکھ اُٹھایا" (۱ پطرس ۳-۱۸)

(د) یُوحنا جو سب رسولوں سے زیادہ مسیح کا دلی دوست اور رفیق تھا اُس کی نسبت صاف لکھتا ہے کہ "اُس میں گناہ نہیں ہے" (۱ یُوحنا ۳-۵) اور استفنُس جب وقت اس پر ایمان لانے کے سبب قتل ہونے ہی کو ہے اُسے "الصادق" کہتا ہے۔ (اعمال ۷-۵۲) اور پولس جو پہلے مسیح کا جانی دشمن تھا اُسکی نسبت لکھتا ہے کہ "وُہ گناہ سے واقف نہ تھا" (۲ قرنتیوں ۵-۲۱) اور عبرانیوں ۴-۱۵ میں یہ لکھا ہے کہ "وُہ ہر طرح سے ہماری طرح آزمایا گیا تاہم بیگناہ رہا"+

اِن گواہیوں کی نسبت خاص کر اس بات پر لحاظ رکھنا چاہیئے کہ یہ سب اتفاقاً ہی دی یا لکھی گئی ہیں - اگر خاص مسیح کی بیگناہی کے بیان میں کوئی کتاب اُس کے کسی ہمعصر کی طرف سے لکھی جاتی یا کوئی وعظ

کہا جاتا۔ تو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ شاید حواریوں نے یوں ہی اپنی طرف سے یہ خیال پیدا کیا۔ لیکن واقع میں یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ اُن سب گواہیوں کی پہلی اور پچھلی عبارت میں اَور کسی بات کا ذکر ہے اور مسیح کی بیگناہی کی طرف صرف اشارہ ہے۔ یہاں تک کہ صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ سننے والوں یا پڑھنے والوں کو اس باب میں کچھ شک نہیں تھا۔

چھٹا باب

انجیل کی گواہی

مسیح کی بے گناہی کی جن گواہیوں کا اب تک ذکر ہو چکا ہے وہ سب عام طور پر اور اکثر نفی کے الفاظ کے ساتھ دی گئی ہیں یعنی اُن میں مسیح قدوس یا بے عیب یا بے قصور کر کے مذکور ہے۔ لیکن ان کے سوا ایک اَور طرح کی بھی گواہی موجود ہے جو ان کی طرح ایک فقرے یا جملے میں تو نہیں آگئی ہے بلکہ بہت ورقوں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتی ہے تاہم جب اس طرح معلوم ہو گئی تو ان گواہیوں سے بھی زیادہ دل پر نقش ہوتی ہے اور بالکل اثباتی بھی ہے۔ یعنی اُس میں نفی کا لفظ نہیں ہے۔ یہ مسیح کے افعال کا وہ بیان ہے جو چاروں انجیلوں میں قلمبند ہے۔ اس میں یہ الفاظ تو نہیں ہیں کہ مسیح بیگناہ ہے لیکن ان سے کہیں بہتر بات مندرج ہے یعنی اُس میں مسیح کی وہ کامل نیکی تصویر کی طرح

صاف دکھائی دیتی ہے جس کے ساتھ گناہ نہیں رہ سکتا۔ مگر اُس پر زیادہ غور کرنے سے پہلے ضرور ہے کہ ہم ان دو باتوں پر لحاظ کریں۔

۱۔ یہ کہ دینی عقیدوں کا ثبوت دل ہی کی راہ سے عقل کو پہنچتا ہے جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے۔ اس واسطے ممکن ہے کہ کوئی شخص چاروں انجیلوں کو پڑھ کر بھی مسیح کی بیگناہی کا نتیجہ اُن سے نہ نکالے بلکہ اُسے خاص نیک آدمی بھی نہ سمجھے۔ یہ ممکن تو ہے لیکن آسان نہیں کیونکہ اکثر آدمیوں کے دل ایسے خراب نہیں ہیں کہ اُن میں مسیح کے افعال کے بیان سے کچھ اثر نہ ہو۔

۲۔ بات یہ ہے کہ اسکی کچھ دلیل نہیں کہ انجیلوں کے لکھنے کی غرض مسیح کی بیگناہی کا ثابت کرنا تھا اُس کے برعکس صاف ظاہر ہے کہ اِن کتابوں کے مصنّف اور اُس زمانہ کے پڑھنے والے مسیح کی بیگناہی کو مان چکے تھے اور چونکہ یسوع ناصری کے مزاج سے اُن کے دلوں میں نہایت ہی زور آور اور غالب تاثیر ہو چکی تھی۔ اس لئے مصنّفوں نے لکھنے کی تکلیف اختیار کی۔ اور پڑھنے والوں کو یسوع کا احوال کتاب میں لکھا ہوا دیکھنے کی آرزو ہوئی۔ پھر جتنی کتابیں دُنیا میں تصنیف ہوئیں کسی کی عبارت انجیلوں سے زیادہ سیدھی سادی نہیں ہے۔ یعنی اُن کے مصنّف یسوع کی تعریف یا اَور کچھ اپنی طرف سے بہت کم لکھتے ہیں۔ بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی یہی غرض تھی کہ واقعات کو صحیح صحیح بیان کریں۔

یہ ممکن نہیں کہ ہم اس مختصر رسالے میں مسیح کی بیگناہی کے ثبوت میں

انجیلوں سے بہت سی مثالیں پیش کریں - اس ثبوت کے واسطے یہ ضرور ہے کہ ہر ایک پڑھنے والا یہ باتیں جو ہم اب بیان کرتے ہیں یاد رکھ کر انجیلوں کا مطالعہ کرے +

۱- انجیلوں کے مطالعہ کرنے کے وقت شاید سب سے پہلے یہ بات دل میں آتی ہے کہ مسیح کے دل کی قوتوں میں کیسی موافقت تھی - وہ صفت جو اطمینان کے لفظ سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے کس قدر کمال کے ساتھ مسیح میں دکھائی دیتی ہے +

۲- لیکن اکثر جو آدمی مطمئن ہیں اور جن کے دل خوب چین سے رہتے ہیں - وہ کمزور بھی ہوتے ہیں اور دنیا پر بہت اثر نہیں ڈال سکتے - ایسے لوگوں کا اطمینان کچھ بہت تعریف کے قابل نہیں ہے لیکن مسیح کا اطمینان ایسا نہ تھا - بلکہ آدمیت میں جو صفتیں بالذات متضاد ہیں اور جن میں سے ایک نہ ایک کے غالب ہونے کے سبب اکثر لوگ مطمئن نہیں رہتے وہ صفتیں مسیح میں دبی ہوئی نہیں تھیں - بلکہ ہر ایک دو متضاد صفتیں خوب مضبوط تھیں - اب ہم ایسی کئی متضاد صفتوں کا ذکر کرتے ہیں +

۳- مسیح کے مزاج میں خصوصیت اور عمومیت دونو انتہا درجے کی پائی جاتی تھیں - یسوع ایک خاص خاندان اور خاص قوم اور خاص زمانہ کا شخص تھا اور جو جو فرائض ان تعلقات کے سبب اس پر عائد ہوتے تھے ان سب کو وہ کامل طور پر ادا کرتا تھا - اس نے مرتے وقت

تک اپنی ماں کا خیال رکھا اور ہمیشہ یہودیوں کی پوشاک پہنتا اور یہودیوں کے چلنے دستور بے عیب تھے اُن سب پر عمل کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کا مزاج کسی خاص خاندان یا قوم یا زمانے کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں تھا۔ اُس کا چھلکا گویا یہودیت تھی لیکن اُس کا گودا محض انسانیت تھی۔ یہودیوں کے سے تعصب اور باقی قوموں کی حقارت کرنے کا اُس میں نشان بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ قول و فعل سے اس تعصب کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کی نیکیاں خاص یہودیت کی نہیں بلکہ انسانیت کی ہیں۔ اس امر میں مسیح اور اَور دینی مصلحوں میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ بعض مصلحوں نے حد سے زیادہ عمومیت کو اختیار کیا۔ یعنی اپنے خاندان اور اپنی قوم اور اپنے زمانہ کے خواص کی تحقیر کر کے اپنے تئیں کُس مَپلِٹان ٹھہرایا۔ یعنی تمام دنیا کو اپنا وطن کہا۔ اور اکثر اُن میں سے اپنی قوم اور زمانہ کے خواص کے پابند رہے۔ مثلاً محمد صاحب کیسے بالکل عرب تھے۔ اور رامچندر کے احوال خاص اسی واسطے ہندوؤں کے دل پسند ہیں کہ وہ سراسر ہندستانی تھے۔ اور اُن کے دینی خیالوں میں کوئی بھی نئی بات نہیں ہے پس غیر ممکن تھا کہ ان کے ہمعصر اور ہموطن اُن کو مار ڈالیں یا ان کی مخالفت کریں۔ بلکہ اگر ایسا کرتے تو گویا اپنے پہلو ٹھے کو مار ڈالنا ہوتا۔

۴۔ پھر مسیح کے مزاج میں خود مختاری اور ہمدردی دو نو صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ آدمیوں سے روحانی مدد لینے کا محتاج نہ رہا اور مخالفوں کے حملے سہنے کے لئے اپنے واسطے آپ کافی تھا۔ اور وہ اَوروں سے لینا

نہ تھا بلکہ ہمیشہ اَوروں کو دیتا تھا۔ وہ اَوروں کو سنبھالتا تھا اور آپ کسی کے سنبھالنے کا محتاج نہ تھا۔ اگرچہ یہ صفتیں اَور بھی بہت سے آدمیوں میں پائی جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی اُن میں غرور اور اَوروں کی تحقیر اور کمزوروں پر سختی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اور اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ مسیح میں یہ باتیں نہ تھیں ۔

۵۔ پھر مسیح کے مزاج میں چستی اور صبر دونوں ملے ہوئے تھے ہم میں اکثر چست آدمی جو بہت کام کرتا ہے بے صبر ہوتا ہے اور صابر آدمی اکثر سُست رہتا ہے لیکن مسیح کا ایسا حال نہ تھا۔ وہ ہمیشہ نیک کام کرتا پھرتا تھا۔ اور جیسا اُس کا قول تھا کہ "جس[۱] نے مجھے بھیجا ہے مجھے اس کے کام دن ہی دن میں کرنے ضرور ہیں" ویسا ہی اُس کا عمل بھی تھا۔ کیا کسی زمانہ میں مسیح سے کوئی آدمی زیادہ کامی ہوا ہے؟ نہیں۔ اور کیا کسی زمانہ میں اُس سے کوئی زیادہ صابر ہوا ہے؟ نہیں۔ وہ اُس زمانہ میں بھی برابر[۲] مرد غمناک اور آشنائے رنج تھا "جب گنہگاروں کی عداوت اس حد کو نہیں پہنچی تھی کہ وہ جسمانی دُکھ میں مبتلا ہو۔ اُس وقت بھی وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کی نادانیوں اور سستیوں سے ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا اور اس رنج اور دُکھ کی جیسی برداشت کرتا تھا وہ سب پر روشن ہے۔ غرض اُس کے سارے کاموں میں دُکھ سہنا شامل تھا اور اس کی ساری برداشت اُس کا اختیاری فعل تھا ۔

---

[۱] اعمال کے ۱۰۔ ۳۸ کو دیکھو [۲] یوحنا کے ۹-۴ کو دیکھو [۳] یشعیاہ ۵۳-۳

۶- اسی طرح رعب اور فروتنی دونو مسیح کے مزاج میں کیسی ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُس کا ذاتی رعب اُس کے چہرہ سے بھی ایسا نمایاں تھا کہ جب لوگوں نے اُسے سنگسار کرنے کے واسطے پتھر اُٹھائے تو ہیبت کے مارے اُن کا یہ حال ہُوا کہ پتھر ہاتھ سے چھُوٹ گئے (یُوحنّا ۸-۵۹ اور ۱۰-۳۱) اور جو اُسے پکڑنے کے لئے آتے تھے وہ اُس کو دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گئے اور زمین پر گر پڑے (یُوحنّا ۱۸-۶) پھر اُس میں فروتنی ایسی تھی کہ ایک دفعہ سوار ہونے کی ضرورت ہوئی تو گدھی کے بچّے پر سوار ہُوا۔ (یُوحنّا ۱۲-۱۴) اور جب اپنے شاگردوں کے ساتھ کھانے بیٹھا تو اپنی کمر باندھ کر اُن کے پاؤں کو دھویا۔ (یُوحنّا ۱۳-۴ و ۵)

۷- اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا سبب تھا کہ مسیح کے مزاج میں اتنی متضاد صفتیں ایسی انتہا درجے کی اور ایسی موافقت کے ساتھ رہیں۔؟ ان کا ایسا کونسا مرکز تھا جس پر قرار پکڑ کے وہ بے مزاحمت ظاہر ہو سکتی تھیں اور ایک دوسرے کو بالکل نہیں روکتی تھیں؟ یہ مرکز وہی صفت تھی جو تمام انسانی نیکی کی اصل ہے اور باقی تمام صفتوں کی موافقت کا باعث ہے۔ یعنی خدا کی محبّت۔ وہ جو کچھ کام کرتا یا دُکھ سہتا تھا سو دیدہ و دانستہ خدا کی محبّت ہی کے سبب کرتا اور سہتا تھا اسی پر اس کی رُوح ہمیشہ قائم رہی۔ یہی اُس کے نزدیک اُس کے اطمینان اور اس کے صبر کا مبدا تھا۔ اسی کے سبب سے باقی تمام متضاد صفتیں اس سے ظاہر ہوتی تھیں اور اس کا کچھ خطرہ نہ تھا کہ ایک دوسرے پر غالب

آئے۔ گھر اور وطن کی محبت اور تمام انسان کی محبت۔ خودمختاری اور ہمدردی چستی اور صبر۔ رعب اور فروتنی یہ سب مسیح میں اسی وجہ سے جمع تھیں اور اسی وجہ سے اپنی اپنی جگہ پر ٹھیری رہیں۔ اور اسی وجہ سے زور آور اور مؤثر تھیں کہ وہ ہمیشہ خدا سے مقاربت رکھتا رہا۔ اسی طرح راستی اور دینداری کا وہ اجتماع (جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مسیحی دین کا ایک خاصہ ہے) پہلے مسیح ہی سے ظاہر ہؤا۔ مسیح تو کئی دفعہ رات بھر دعا مانگتا رہا۔ لیکن دعا میں مشغول ہونے کے سبب وہ کبھی آدمیوں کی خدمت کرنے یا اُن کی محبت کے اظہار سے غافل نہیں رہا۔ مرقس ۱-۳۵ سے ۳۹ تک دیکھو۔ پھر وہ گوشہ نشینوں کے طور پر نہیں رہتا تھا بلکہ اسی طرح آدمیوں میں رہتا تھا جس طرح اور آدمی رہتے ہیں یعنی لوگوں کے ساتھ کھاتا پیتا اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے وہ کبھی دنیا پرست نہیں بنا اور نہ خدا کو بھولا۔ برعکس اس کے جو کچھ وہ آدمیوں کے ساتھ برتاؤ رکھتا تھا اس سب کی محرک اُسکی دینداری تھی ٭

ساتواں باب

خود مسیح کی گواہی

مسیح کی کامل نیکی کا جو کچھ انجیل میں بیان ہؤا ہے اُس کو سن کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ حواری لوگ صرف اس کے ظاہری چال چلن سے واقفیت

رکھتے تھے۔ اور اُن کی گواہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ باطن میں بھی بیگناہ ہو۔ اس اعتراض کے ہمارے پاس دو جواب ہیں جن میں سے ایک تو ہم آگے لکھیں گے اور ایک اِس مقام پر لکھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ البتہ اگر مسیح اپنی بیگناہی کی نسبت خود کچھ گواہی نہ دیتا تو اوروں کی گواہی سے ہم کو کامل یقین نہ ہو سکتا۔ کیونکہ "انسانوں[ل۱] میں سے کون کسی انسان کا حال جانتا ہے سوا اُس انسان کی روح کے جو اس میں ہے"۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اگر اکیلے مسیح ہی کی گواہی ہوتی تو اس پر کچھ بھی اعتماد نہ ہو سکتا۔ لیکن بیگناہی ایک ایسی عجیب بات ہے جس کے لئے ضرور ہے کہ بیگناہ آدمی اوروں کے سامنے اُس کا دعوےٰ کرے اور جب تک وہ خود اُس کا دعویٰ نہ کرے اوروں کی گواہی اُس کی نسبت کافی نہیں ہو سکتی +

پس پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ مسیح نے کبھی اپنے تئیں گنہگار نہیں مانا۔ وہ اَور سب مرشدوں سے زیادہ گناہ کا بھید ظاہر کرتا تھا اور اُن پردوں کو جن سے گناہ چھپا رہتا ہے پھاڑ ڈالتا تھا اور پھر وہ سب طرح سے آدمیوں کو اُبھارتا تھا کہ اپنے گناہ پہچان کر اقرار کریں لیکن جتنی باتیں اُس نے کہیں اُن میں سے کسی بات میں اُس کی اپنی گنہگاری کی طرف کچھ اشارہ نہیں پایا جاتا۔ وہ خدا سے ہمیشہ دعا مانگتا تھا لیکن اُس نے کبھی خدا سے گناہ کی مغفرت نہیں چاہی۔ یوحنّا جن کو بپتسمہ دیتا تھا اُن سے گناہوں کا اقرار کراتا تھا اور وہ اپنے پیچھے والوں کو توبہ کا

[ل۱] ۱ کرنتھیوں ۲-۱۱ کو دیکھو +

بپتسمہ کہتا تھا اور مسیح نے اپنے بپتسمے کو نئی پیدائش کا وسیلہ ٹھیرایا۔ لیکن جب مسیح نے خود یوحنّا سے بپتسمہ پایا تو نہ گناہوں کا اقرار ہؤا اور نہ توبہ اور نہ نئی پیدائش کا ذکر بلکہ اُس نے یہی کہا کہ ”ہمیں اسی طرح ساری راستبازی پوری کرنی مناسب ہے“۔ (متی ۳-۱۵)

دوسرے اُس نے اپنے تئیں صاف بیگناہ کہا۔ یوحنّا ۸-۴۶ میں لکھا ہے کہ ”اُس نے یہودیوں سے کہا کہ تم میں کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے“۔ اِس قول کو سُنتے ہی ہم جان لیتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ ہم میں سے جتنا کوئی نیک ہے اُتنا ہی وہ اپنی گنہگاری کو پہچانتا اور اِس کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن مسیح اپنے شاگردوں بلکہ تمام دُنیا سے الگ ہو کر فرماتا ہے کہ تم میں کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے۔ بعضے یہ سمجھے ہیں کہ اس مقام پر لفظ ہمرتیا[1] کے وہ معنے ہیں جو یونان میں لکھی ہوئی کتابوں[2] میں پائے جاتے ہیں یعنی غلطی۔ لیکن ایک تو اگر لفظ کے یہ معنی ہوتے تو بھی اس سے ہمارا مدّعا ثابت تھا کیونکہ وہی آدمی ہمیشہ غلطی سے بچ سکتا ہے جو گناہ سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے یہ معنی اُن کتابوں میں ایسے ہی مقامات پر پائے جاتے ہیں جہاں ہمرتیا کے ساتھ کوئی اَور بھی لفظ ہے۔ مثلاً ایک جگہ یوں لکھا ہے

---

[1] ہمرتیا ایک یونانی لفظ ہے اور دینی کتابوں میں جس جگہ لفظ گناہ آیا ہے وہ اسی لفظ کا ترجمہ ہے +

[2] اِن سے وہ یونانی کتابیں مراد ہیں جن میں صرف پُرانے یونانی مذہب کے خیالات کی تاثیر ہے

"قانونوں کی نسبت صحت اور غلطی"۔ دوسری جگہ "ارادہ کی صحت یا اُس کی غلطی"۔ تیسری جگہ "بدی کے ساتھ نہیں بلکہ رائے کی غلطی سے" ان مقاموں میں جس لفظ کا ترجمہ غلطی کیا گیا ہے وہ ہمرتیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہاں اُس کے یہ معنے یعنی غلطی قرینہ ہی سے نکلتے ہیں۔ اور عہد نامہ جدید میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جس میں ہمرتیا کے یہ معنی بخوبی صادق آتے ہوں۔ پھر یوحنا کے ۸۔ ۴۶ کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسیح نے پہلے یہ کہا تھا کہ مَیں جو تُم سے سچ بولتا ہوں اِسی لئے تم میرا یقین نہیں کرتے تو اِس کے بعد اگر اُس کا یہ مقصود ہوتا کہ کون مجھ پر غلطی ثابت کرتا ہے تو اس سے اُس پہلے مضمون کی کچھ تائید نہ ہوتی۔ بلکہ یہ اُس سے بھی کمزور بات ہوتی۔ لیکن جب ہم اس مقام پر ہمرتیا کے وہی معنے لیتے ہیں جو عہد جدید کے اور سب مقاموں میں ہیں یعنے گناہ۔ تو اوپر اور نیچے کے مضمون میں بخوبی ربط پیدا ہوجاتا ہے یعنی مسیح اپنی بیگناہی ظاہر کرکے اپنی سچائی ثابت کرتا ہے۔ گویا وہ یہ کہتا ہے کہ مَیں جو بیگناہ ہوں اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مَیں اُن باتوں میں جو خُدا سے علاقہ رکھتی ہیں تم کو گمراہ نہیں کرسکتا اور جب میں سچ بولتا ہوں تو پھر تم مجھ پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔

اوپر کے بیان سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ اس آیت میں ہمرتیا کے معنی گناہ ہیں۔ لیکن پھر اس مقام پر دو اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ مسیح نے اتنا ہی کہا کہ "کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے" یہ نہیں کہا کہ مجھ میں

گناہ نہیں ہے۔ لیکن جب وہ ہمیشہ ریاکاری کی مخالفت ایسے زور سے کرتا تھا تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے گناہ سے واقف ہو کر اس بات پر فخر کرتا کہ کوئی آدمی میرے گناہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ یا ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر مسیح اپنے تئیں خدا کے سامنے گنہگار جانتا تو ایسی بات کا کہنا ہی بڑا گناہ ہوتا +

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مسیح فقط انکار کرتا ہے کہ میں گنہگار نہیں ہوں۔ یہ نہیں کہتا کہ میں کمال نیک اور پاک ہوں۔ ہاں اس مقام پر تو وہ صاف یہ بات نہیں کہتا۔ لیکن اور مقاموں میں وہ صاف اپنی نیکی اور پاکی کا حال بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "میرا کھانا[۵۱] یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں اور اس کا کام پورا کروں" اور[۵۲] "میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں"۔ اور[۵۳] "میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں" +

آٹھواں باب

ان اعتراضوں کے جواب جو مسیح کی بیگناہی کے امکان پر کئے گئے ہیں

جب مسیح کی بیگناہی اس طرح پختہ دلیلوں سے ثابت ہو چکی تو اس پر

[۵۱] یوحنا ۴-۳۴ [۵۲] یوحنا ۸-۲۹ [۵۳] یوحنا ۵-۳۰ +

جو اعتراض کئے گئے ہیں ہمکو اُن کی طرف کچھ بہت توجہ کرنی ضرور نہیں مگر پھر بھی جو مشہور اعتراض ہیں اُن کا جواب دینا مناسب ہے۔ اِن کو ہم تین قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔ اوّل وہ اعتراض جو مسیح کی بیگناہی کے امکان ہی پر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو انجیل کی گواہی کے معتبر ہونے پر کئے گئے ہیں۔ تیسرے وہ جو مسیح کے بعضے افعال اور اقوال پر ہوتے ہیں۔ اب ہم اس بات میں پہلی قسم کے اعتراضوں کے جواب دیتے ہیں ٭

۱۔ پہلے ہم اُس اعتراض کا ذکر کرتے ہیں جسکا جواب دینا ہمکو سب سے زیادہ ضرور ہے کیونکہ اُسکا جواب دئے بغیر ہماری اس کتاب سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ بیگناہی آدمی کے لئے بالضرور غیر ممکن ہے۔ اور اس اعتراض کی تین دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کی گنہگاری

1 مخلوق کی ناتمامی میں داخل ہے۔ اسکا جواب ہم کتاب "حقیقت گناہ" میں دے چکے ہیں۔ کہ گناہ اور ناتمامی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دوسری

2 دلیل یہ ہے کہ آدمی میں حیوانیت کے سبب سے بیگناہی غیر ممکن ہے۔ اسکا جواب بھی اُسی کتاب میں دیا گیا ہے کہ گناہ اگرچہ جسم سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی کبھی جسم کے سبب سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی خود بالکل روحانی چیز ہے۔ بلکہ جو سب سے بڑے گناہ ہوتے ہیں وہ جسم

3 سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ ہم نے نہ کبھی بیگناہی کا تجربہ کیا اور نہ بیگناہ آدمی کو دیکھا۔ پس اس سبب سے ہم ایسے شخص کا

خیال بھی نہیں کر سکتے لیکن یہ کہنا کمال نادانی کی بات ہے کہ جو کچھ ہمارے تجربہ سے باہر ہے وہ ہمارے خیال سے بھی باہر ہے۔ گویا ہمارا نہایت محدود تجربہ ساری دُنیا کا پیمانہ ہے۔ برعکس اسکے اگر ہم قدوس خدا اور اسکی پاک شریعت پر یقین کرتے ہیں تو آدمی کی بیگناہی کے امکان کو بھی ماننا ضرور ہوگا۔ اِس سے یہ مُراد نہیں ہے کہ جو گنہگاری ہم اپنے میں اور اَوروں میں بھی صاف علامتوں سے پہچانتے ہیں اس سے انکار کریں بلکہ یہ ہے کہ آدمی کی شرارت کا تجربہ کتنا ہی پے درپے کیوں نہ ہو پھر بھی ہم ہمیشہ اِس بات کے امکان کے اقرار پر قائم رہیں کہ کسی نہ کسی آدمی میں ایسی انسانی بیگناہی جو خدا کی ذات کا عکس اور اُسکی شریعت کی بجا آوری ہو ظاہر ہوا یا ہوئی ہو ؛

یہ اعتراض کبھی کبھی اس پیرایہ میں پیش کیا جاتا ہے کہ کسی جنس کی تمام خوبیاں اُسکے ایک فرد سے کبھی ظاہر نہیں ہوتیں۔ بلکہ کسی میں کوئی خوبی ہوتی ہے اور کسی میں کوئی۔ یہانتک کہ تمام جنس تو کامل کہلا سکتی ہے۔ مگر اُس کا ایک فرد کامل نہیں کہلا سکتا۔ لیکن یہ دعوٰے تجربے سے آزمائے جانے کے قابل ہے۔ علاوہ اِس کے جاننا چاہیئے کہ گناہ اور بیگناہی اَور نقصوں اور خوبیوں کے برابر نہیں۔ چنانچہ گھوڑوں کی جتنی خوبیاں ہیں وہ گھوڑوں کی تمام جنس ہی میں پائی جائیں گی۔ اور آدمی کی عقل کی جتنی خوبیاں ہیں شاید وہ بھی تمام آدمیوں کے ملانے سے ہی حاصل ہونگی۔ لیکن نیکی اور بدی جو ہیں وہ ہر فرد بشر پر موقوف ہیں

اور اُس سے الگ نہیں ہوسکتیں۔ اِس سبب سے جب ہر ایک آدمی گنہگار ٹھیرا تو آدمیوں کی تمام جنس بیگناہ نہیں۔ بلکہ گنہگار ہی ٹھیرگی۔ اور اِس طرح سے اگر ایک بھی آدمی بیگناہ نہیں ہوا تو بیگناہی کسی صورت سے ظاہر نہیں ہوئی +

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مسیح جو رفتہ رفتہ کامل ہوا اس سے ظاہر ہے کہ وہ شروع میں بیگناہ نہ تھا۔ بلکہ لڑکپن کے زمانہ میں خواہ مخواہ بچوں کی سی نادانی اور ضد اُس سے ظاہر ہوتی ہوگی۔ پس رفتہ رفتہ ان عیبوں سے پاک ہوکر وہ ایسا کامل شخص نکلا ہوگا جس کا بیان انجیلوں میں ہے +

اس کا جواب یہ ہے کہ مسیح کی ترقی جو رفتہ رفتہ ہوئی اسمیں تو کلام نہیں۔ لوقا ۲۔ ۴۰ و ۵۲ کو اور عبرانیوں کے خط ۲۔ ۱۰ اور ۵۔ ۹ کو دیکھو۔ لیکن اِس سے اسکی گنہگاری کس طرح ثابت ہوتی ہے معترض کا یہ دعوٰے کچھ تو معمولی انسانی تجربے پر موقوف ہے اور کچھ اِس خیال پر کہ ناتمامی میں گناہ داخل ہے۔ لیکن اوپر ثابت ہوچکا ہے کہ اِس بحث میں ہمیں ایک معمولی انسان سے واسطہ نہیں بلکہ ایسے شخص سے جسکی خصلتیں بے نظیر تھیں۔ اور یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ ناتمامی میں گناہ داخل نہیں۔ اسکے علاوہ اعتراض مذکورۂ بالا کا کافی جواب یہ ہے کہ آدمی کا مزاج ایسا تغیر پذیر نہیں جسمیں ایسی کاملیت کے پیشتر جیسی انجیلوں میں بیان کی گئی ہے گنہگاری کا رہنا ممکن ہو یعنی اول مسیح تیس۳۰ برس تک تو گنہگار رہے اور پھر ساڑھے تین برس تک بیگناہ رہے۔ اگر اُس

سے لڑکپن میں گناہ ہوتا تو خواہ مخواہ اُن ساڑھے تین برس میں بھی کبھی نہ کبھی ظاہر ہوتا ۔

یہ خیال کہ ترقی میں گناہ ضروری ہے اور بگڑنا ہی کے ثبوت کے واسطے بتدریج ترقی سے انکار کرنا ضرور ہے ۔ اکثر آدمیوں میں پایا جاتا ہے ۔ اِسی سبب سے جب ہندو لوگ رام اور کرشن کو خدا ماننے لگے تو یہ بھی گمان کرنے لگے کہ اُن کے لڑکپن کے زمانہ میں بھی الٰہی قدرت اور علم اُن سے ضرور ظاہر ہُوا ہوگا ۔ گویا عام کمزوری اور کم عقلی کاملیت کے منافی ہیں ۔ اور اِسی سبب سے موضوع انجیلوں[۱] میں مسیح کے لڑکپن کے بیان میں ایسے قصے پائے جاتے ہیں لیکن صحیح انجیلوں میں جو مسیح کا ذکر ہے وہ اُنکی نسبت کامل انسان کے کس قدر زیادہ لائق ہے یعنی مسیح اپنی زندگی کے ہر ایک حصّے میں اُسی حصّے کے فرائض ادا کرتا تھا اور یہ فرائض گناہ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ۔ جب چھوٹا بچّہ تھا تو اُسکی قوتیں کونپل کی طرح صرف پھوٹنے لگی تھیں ۔ اور جب ذرا بڑا ہو گیا تھا تو اپنے بزرگوں کی فرمان برداری کرتا تھا اور سب کچھ سیکھتا اور دیکھتا تھا ۔ جب جوان ہُوا تو اپنے دُنیاوی محافظ یوسف کے پیشہ میں اُسکی مدد کرنے لگا ۔ جب پورا مرد ہوا تو اپنا خاص منصبی کام کرنے لگا ۔ چنانچہ ایرینیس[۲] کہتا ہے کہ مسیح عمر کے ہر ایک حصّے میں سے گذرا

۱؎ یہ وہ کتابیں ہیں جو چوتھی صدی کے بعد لکھی گئیں اور انجیلوں کے نام سے مشہور ہوئیں مگر یہ معتبر نہیں گنی جاتیں ۔ ۲؎ یہ ایک مشہور بزرگ ہے جو دوسری صدی میں گذرا ہے

وہ بچوں کے لئے بچہ ہوا تاکہ بچوں کو پاک کرے اور لڑکوں کے لئے لڑکا ہوا تاکہ لڑکوں کو پاک کرے وغیرہ" وہ اپنی ترقی کے ہر ایک درجہ بلکہ ہر ایک لمحہ میں جو جو چیزیں دُنیا میں اُس کے شایاں تھیں اُن سب کو اختیار کرتا رہا اور جو جو چیزیں اسکے لائق نہ تھیں ان کو ترک کرتا رہا +

۳- تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مسیح کی آزمائش ہوئی اور آزمائش ہوتے پر اُسکی بیگناہی نہیں رہ سکتی - اگر وہ بالکل بیگناہ ہوتا تو آزمائش میں نہ پڑتا یعنی اگر آزمائش کا احساس اُسکے دل میں نہیں ہوا تو اس کی آزمائش از روئے حقیقت نہ ہوتی - بلکہ صرف از روئے صورت ہوئی - اور اگر آزمائش کا احساس اُسکے دل میں ہوا تو وہ بالکل بیگناہ نہ رہا - لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ آزمائش کیا چیز ہے اور گناہ سے کیا علاقہ رکھتی ہے - اس امر میں دو باتیں سمجھنی اور یاد رکھنی چاہئیں - ایک یہ کہ اگر بُرا خیال ہمارے دل ہی سے پیدا ہو تو وہ گناہ ہے کیونکہ وہ گناہ آلودہ دل سے پیدا ہوا ہے لیکن اگر وہ خارج سے آئے تو گناہ نہیں بلکہ صرف آزمائش ہے - غرض بُرے خیال اور بُرائی کے خیال میں زمین و آسمان کا فرق ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم اس بُرائی کے خیال کو جو خارج سے آئے منظور کریں اور ہمارا دل اُسکو قبول کرے تو گناہ ہو گیا - ورنہ محض آزمائش رہتی ہے پس اگر یہ ثابت ہو سکتا کہ مسیح کی آزمائش کے وقت بُرائی کے خیال اسی کے دل سے پیدا ہوئے یا خارج سے اُسکے سامنے آکر ایک لمحہ کے لئے بھی مقبول ہوئے تو مسیح ہرگز بیگناہ نہ ٹھہر سکتا - لیکن ان دو باتوں میں سے

اوّل بات تو اُس کے حق میں کبھی ثابت نہیں ہو سکتی اور دوسری بات کے برعکس وُہ اکثر آزمائشوں میں بُرائی کے خیال کو جوں ہی اُس کے دل میں آتا تھا وہیں بڑے زور سے نکال دیتا تھا۔ متی ۴-۴ و ۷ و ۱۰-۱ اور خصوصاً ۱۶-۲۳ کو دیکھو۔ لیکن جو آزمائش اُسکی موت کے نزدیک ہوئی اُنہیں البتہ یہ بات ایسی صاف ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ برعکس اسکے سرسری نظر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسیح نے موت سے بچنے کا خیال جو خارج سے اُس کے دل میں آیا تھا قبول کر لیا تھا۔ یُوحنّا ۱۲-۲۷ اور مرقس ۱۴-۳۶ کو دیکھو۔ یہ البتہ ایسی سخت آزمائش کا وقت تھا اور اُس پر ایسے زور سے حملہ ہوتا تھا جس سے گمان ہو سکتا تھا کہ عنقریب گر پڑے۔ اتنا تو ماننا ضرور ہے لیکن یہ ہرگز صحیح نہیں کہ موت سے خوف کرنا ہی گناہ ہے۔ بلکہ مسیح کو جو یہ خوف ہوا اس سے اسکی انسانیت ایسی ثابت ہوگئی کہ اَور کسی بات سے ثابت نہ ہو سکتی۔ یہ خوف اور موت سے بچنے کا خیال اور خواہش جو اُس خوف کے ساتھ پیدا ہوئی یہ تینوں باتیں خارج سے یعنی اُسکے جسم سے اسکے دل میں آئیں اور اگر وہ دیدہ دانستہ اُنہیں اپنے دل میں جگہ دیتا یعنے خدا کی مرضی کی جو اس کی موت ہی سے پوری ہو سکتی تھی کچھ بھی مخالفت کرتا تو گناہ کرتا۔ مگر برعکس اسکے اُس نے فوراً اُسی خدا سے وہ خوف اور خیال اور خواہش بیان کی اور بیان کرنے وقت بھی اُنہیں خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ پس جب مسیح کی آزمائش میں گناہ کا لگاؤ ثابت نہیں ہو سکتا تو یہ بات اُسکی بےگناہی کے لئے ایک اَور پختہ دلیل ہے کہ اگرچہ سب طرح سے

اسکی آزمائش ہوئی پھر بھی وہ گناہ میں مبتلا نہیں ہوا۔

۴۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اگر مسیح بیگناہ ہوتا تو ہمارے لئے نمونہ نہ ہوسکتا یعنی جب ہم لوگ دُنیا میں بالکل بیگناہ نہیں ہوسکتے تو بالکل بیگناہ نمونہ سے ہم کو کیا فائدہ۔ لیکن ہنر اور آور سب دنیاوی معاملوں میں کوئی نمونہ جتنا کامل ہوسکتا ہے اتنا ہی فائدہ مند معلوم ہوتا ہے اور اگر بالکل کامل ملسکتا تو اَور بہتر ہوتا۔ کیونکہ نمونہ سے یہ غرض نہیں ہوتی کہ ہم یکبارگی بالکل اُس جیسے ہو جائیں بلکہ یہ ہوتی ہے کہ اُس کو اپنی نظر میں رکھکر رفتہ رفتہ اُسکی مانند ہوتے جائیں۔

۵۔ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ مسیح جو مریم سے پیدا ہوا اس واسطے جو لوگ موروثی گنہگاری کا عقیدہ مانتے ہیں وہ مسیح کو بیگناہ نہیں ٹھیرا سکتے۔ لیکن مسیحی لوگ جو مسیح کی اعجازی پیدائش کو مانتے ہیں خاصکر اسی لحاظ سے اُس پر بڑا زور ڈالتے ہیں کہ اُس کے سبب موروثی گناہ مسیح کو نہیں پہنچا۔ اور مسلمان لوگ بھی مسیح کی اعجازی پیدائش کے قائل ہیں لیکن اُنکے مذہب میں اُسکے ماننے کا کوئی ضروری سبب نظر نہیں آتا۔ یعنے اگر وہ اس کو نہ مانتے تو اُن کے مذہب میں کوئی خاص خلل نہ آتا لیکن مسیحیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح جو مریم کے رحم میں نہ مرد کے تخم سے پیدا ہوا۔ بلکہ صرف خالق کی قدرت ہی سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے مریم سے محض بشریت حاصل کی اور اُس کے ساتھ کسی طرح کا فساد یا خرابی نہیں پائی۔ کیونکہ وہ انسانی قاعدہ کے موافق نہیں پیدا ہوا۔

۶۔ چھٹا اعتراض یہ ہے کہ جب مسیحی دین میں یہ عقیدہ داخل ہے کہ مسیح نے گنہگاروں کے واسطے دُکھ اور موت کو اُٹھایا۔ بلکہ مصلوب ہو کر ملعون بھی ٹھہرا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ بیگناہ نہیں تھا لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ ہونے اور ٹھہرنے میں امتیاز نہیں کرتے۔ جو ضامن ہوتا ہے وہ قصوروار ہوتا تو نہیں۔ لیکن قصوروار ٹھہرتا ہے اور اس سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ گویا وہ قصوروار ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ مسیح کے کفّارہ کو نہیں مانتے اُن کو مناسب نہیں ہے کہ اُسے کفارہ کے عقیدہ سے دلیل لیکر اس کو گنہگار ٹھہرائیں *

نواں باب

اُن اعتراضوں کا جواب جو انجیل کی گواہی پر کئے گئے ہیں

۱۔ مسیح کے جو احوال انجیل میں مذکور ہیں جب اُن سے اُسکا کمال ثابت ہوتا ہے تو بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ البتہ انجیل میں اب مذکور تو ہے۔ مگر ہم یہ کس طرح جانیں کہ وہ صحیح ہے ؟ اِس قصّے سے فائدہ تو بہت ہوتا ہے۔ بلکہ ایسا مفید قصّہ دُنیا میں کبھی نہیں لکھا گیا۔ مگر پھر ہے تو قصّہ ہی۔ اِس اعتراض کا کسی نے یہ جواب دیا ہے کہ "ایسے قصّہ کیلئے ہم بڑی خوشی سے شکنجہ میں کھینچا جانا یا جلایا جانا"۔ یعنے اگر سخت عذاب دیا جاتا تو بھی اُسکو نہ چھوڑتا اور ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر مسیح کے احوال خیالی

ہیں تو یہ خیال کہاں سے آئے؟ ایسا قصہ کس طرح بن گیا؟ کیا سب مسیحیوں یا سب حواریوں نے ملکر اُسے بنا لیا؟ اگر یہی بات ہے تو اُس میں ایسا بالکلیہ اتفاق ہونے کی کیا وجہ ہے؟ پس کیا ایک آدمی نے اُسے بنایا ہے؟ اگر ایسا ہؤا تو اُس نے یہ خیال اپنے ہی دل سے نکالا ہوگا۔ مگر جب اُس کے دل میں ایسے عمدہ خیال گذر سکتے تھے جیسے مسیح کے ذکر سے ظاہر ہوئے تو وہ آدمی خود مسیح کے برابر ٹھہریگا۔ اور پھر اُس کے ایسا ہونے کے امکان میں وہی شک پیدا ہونگے جو مسیح کے حق میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِسکے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیح کے جان پہچانوں میں کوئی عالم یا بڑا فاضل شخص نہ تھا۔ اور یہ بھی کہ مسیح کی خوبیوں میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ اُس وقت کے یہودیوں کے خیالوں کے بالکل برخلاف ہیں۔ غرض اگر انجیل کے مضامین خیالی ہیں تو اس کا کیا سبب ہے کہ اب تک کسی زمانہ میں اور کسی مُلک میں ایسا قصّہ نہیں لکھا گیا؟

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بن آدمیوں کی گواہی پر انجیل کے مضامین موقوف ہیں یعنے حواری وہ مسیح سے اُس وقت واقف ہوئے جب اُسکی عمر تیس ۳۰ برس کی ہوگئی تھی۔ پس اُن کو اس بات کا علم کہاں سے ہؤا کہ وہ اُس وقت سے پہلے بیگناہ تھا۔ اس کا جواب ہم یہ دیکھچکے ہیں کہ ساڑھے تین برس کی بیگناہی تیس برس کی گنہگاری کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔ اِس کے علاوہ حواریوں میں سے بعض غالباً مسیح کے رشتہ دار تھے اور اکثر اُس کے قرب وجوار کے رہنے والے۔

۴۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ گواہ صرف مسیح کے ظاہری چال و چلن سے واقف ہو سکتے تھے۔ یہ کیونکر جان سکتے تھے کہ وہ باطن میں بھی بیگناہ ہے؟ اس اعتراض کا ایک جواب تو ہم اوپر دے چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ مسیح نے خود بھی اپنی بیگناہی پر گواہی دی۔ اور دوسرا یہ ہے کہ یہ غیر ممکن ہے کہ باطن کا گناہ ساڑھے تین برس کی صحبت میں کچھ بھی چال چلن سے اَوروں پر ظاہر نہ ہو۔ کسی وجہ سے مسیح کی نسبت ریا کا خیال نہیں گذر سکتا تھا۔ اور جس شخص کی نسبت ریا کا خیال نہ گذر سکتا ہو اسکی بول چال سے اُس کے باطن کا حال بخوبی دریافت ہو سکتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ لوگوں کو مسیح کے باطن کے حال سے بھی اچھّی طرح واقفیت ہو گئی ہو۔

دسواں باب

اُن اعتراضوں کے جواب جو مسیح کے بعض افعال و اقوال پر کئے گئے ہیں

جب مسیح ایسا کامل آدمی ٹھہرا تو کچھ تعجّب نہیں کہ اُس کے افعال و اقوال میں بھی بعض ایسی باتیں پائی جائیں جو ہماری سمجھ سے باہر ہوں۔ ہر ایک فاضل آدمی کے افعال و اقوال جو لوگ فضیلت میں اس سے کم ہوتے ہیں کم و بیش اُنکی سمجھ سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ پس ایسے شخص کے احوال میں جیسا کہ ہم مسیح کو ثابت کر چکے ہیں جب ایسی بات پائی جائے کچھ بعید نہیں لیکن

مسیح کے افعال و اقوال جو انجیل میں مذکور ہیں اُن کی نسبت جس قدر شک پیدا ہوں اُنکا دور کرنا انجیل کے مفسّروں کا کام ہے۔ ہم اس مقام پر صرف اجمالاً ان کا جواب دیسکتے ہیں +

۱۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مسیح کے اظہار مقصد میں تبدیلی معلوم ہوتی ہے یعنی وہ اوائل میں تو دُنیاوی بادشاہت کا مشتاق تھا اور جب دیکھا کہ یہودیوں کی مخالفت اور بدسلوکی کے سبب وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تو صرف روحانی بادشاہت قائم کرنے کا خیال کرنے لگا۔ اگر یہ اعتراض صحیح ہوتا تو مسیح کی ایسی نادانی ثابت ہوتی جس کے سبب اُس کی بیگناہی مشکل سے قائم رہ سکتی۔ یہ تو سچ ہے کہ ایک خاص وقت سے مسیح اپنی موت کا زیادہ خیال کرنے لگا اور اُسی وقت سے اُس کا ذکر اپنے شاگردوں سے کرنے لگا۔ متی ۱۶-۲۱ کو دیکھو۔ لیکن جب اُس نے دعوتِ دین شروع کی اُس زمانہ میں بھی تشبیہاً اپنی موت کی طرف اشارہ کیا۔ یوحنّا ۲-۱۹ کو دیکھو۔ اور جب اُس نے حواریوں کو مُقرّر کر کے اُن کو پہلی ہی دفعہ منادی کرنے کو بھیجا تو اُن سے اُن دُکھوں کا حال مفصّل بیان کر دیا جو اُن پر گزرنے والے تھے۔ پس اگر وہ خود دنیاوی بادشاہت کرنے کی اُمّید رکھتا تھا تو کیونکر اُسکے دل میں یہ خیال گزر سکتا تھا کہ میرے شاگرد اُس وقت دُکھ اُٹھائیں گے۔ بلکہ مارے بھی جائینگے متی ۱۰-۱۶ سے ۳۹ تک دیکھو۔ بلکہ اُس کے پہلے وعظ میں بھی ایسا ہی ذکر ہے متی ۵-۱۰ و ۱۱ و ۱۲ کو دیکھو۔ اور ہنوز اُس نے دعوتِ دین شروع نہیں کی تھی کہ شیطان

نے اُسے دنیاوی بادشاہت دکھائی۔ لیکن مسیح نے اُسے قبول نہیں فرمایا ٭

۲۔ مسیح کے بعض افعال ایسے ہیں کہ اگر وہ ایک عام آدمی ہوتا تو اُن کو درست ٹھہرانا بہت مشکل ہوتا۔ لیکن جب ہم یہ جان چکے کہ وہ عام آدمی نہ تھا بلکہ محض ایک خاص کام کرنے کے لئے دُنیا میں آیا تھا تو وہ افعال واجب اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات ہندوؤں کے اِس قول کے مطابق ہے کہ "سامرتھیوں کو دوش نہیں لگتا" کیونکہ اِس میں اور اُس میں بہت فرق ہے۔ اور یہ بھی ہماری مراد نہیں ہے کہ اُلوہیت کے سبب سے مسیح جو چاہتا تھا کر سکتا تھا۔ ورنہ ہمارا سارا بیان اور مباحثہ عبث ہو جاتا۔ کیونکہ اِس سے یہی غرض ہے کہ یسوع ناصری کو ایک بیگناہ آدمی ثابت کریں۔ لیکن اگر ہم اُس کو صرف پیغمبر مانیں اور یہ سمجھیں کہ وہ خدا کی طرف سے ایک خاص کام دُنیا میں کرنے کیواسطے ظاہر ہوا تھا۔ تو بھی یہ ماننا ہوگا کہ اُس کو انجام دینے کے واسطے اُسے بہت سے ایسے کام کرنے ضرور تھے جو عام آدمی کے واسطے ضرور نہیں۔ اور جب ضرور نہیں تو مناسب بھی نہیں۔ چنانچہ یہ کام اُس نے کئے بھی۔ مثلاً جب وہ بارہ برس کا ہوا تو مریم اور یوسف کو چھوڑ کر چلا گیا۔ کسی اور لڑکے کو شاید ایسا کرنا مناسب نہ ہوتا۔ لیکن جب مریم نے اُسے ہیکل میں پایا اُس وقت اُس نے مریم سے جو کچھ کہا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خدا سے جو خاص علاقہ رکھتا تھا اور جس کام کے واسطے دُنیا میں آیا تھا اُس سے اُس وقت خوب واقف

ہونے لگا تھا۔ لوقا ۲-۴۹ کو دیکھو۔ پھر اٹھارہ برس کے بعد اُس نے کوڑا بنا کر جانوروں اور اُن کے مالکوں کو ہیکل سے نکال دیا۔ اور صرافوں کے تختے اُلٹ دیئے۔ (یوحنا ۲-۱۴ سے ۱۶ تک) عام آدمی کو ایسا کام کرنا مناسب نہ ہوتا۔ لیکن وہ چونکہ یہودیوں کو خدا کی طرف رجوع کرنے کے لیئے آیا تھا۔ اِس لیئے اُس کو جائز تھا کہ وہ موقع پا کر ایسا کام کرے۔ پھر اُس نے گرگیسا میں دیووں کو آدمیوں میں سے نکال کر اُنہیں سؤروں میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ اور سؤروں کو ہلاک کرایا۔ (مرقس ۵-۱۱ سے ۱۳ تک) ہم یقیناً تو نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ مگر ممکن ہے کہ سؤروں کے مالک جو یہودی تھے مسیح نے اِس طرح سے اُنکی گستاخی آمیز نافرمانی پر تنبیہ کی ہو۔ جیسا کہ پیشتر ہیکل میں خرید و فروخت کرنے والوں کو کی تھی۔ اور ممکن ہے کہ دیوؤں کا برملا جانوروں میں داخل کر دینا اس واسطے ضرور ہُوا ہو کہ جن آدمیوں پر دیو چڑھے ہوئے تھے ان کو یقین ہو جائے کہ ہم اِن سے چھُوٹ گئے۔ یا شاید اِس غرض سے ضرور ہُوا ہو کہ دیو اُنہیں مروڑنے نہ پائیں۔ بے اذیّت دیئے اُن سے نکل آئیں۔ اور یہ صاف ظاہر ہے کہ آدمیوں کی چھٹکارے کے واسطے حیوانوں کو دُکھ دینا کچھ انوکھی بات نہیں ہے۔ بلکہ خدا کے روزمرّہ کے بندوبست کے موافق ہے۔ اور جب شیاطین کی ایسی مہلک تاثیر ظاہر ہوئی کہ اُنہوں نے بے عقل حیوانوں میں داخل ہوتے ہی اُن کو ہلاک کر ڈالا تو صاف ظاہر ہُوا کہ آدمی کو اُن سے کیسی نفرت کرنی چاہیئے۔ پھر مسیح نے انجیر کے ایک درخت کو سراپ دیا۔

اس کام کا ماحصل یعنی یہ جتانا کہ یہودیوں کی نکمی قوم اسی طرح ملعون ہوگی۔ ایسا بڑا اور ضروری کام تھا کہ اس کے واسطے ایک بے ثمر درخت کا سکھا دینا کچھ قابل لحاظ نہ تھا۔ (متی ۲۱-۱۸ سے ۲۲ تک) پھر مسیح حالانکہ یہودا اسکریوتی کا مزاج جانتا تھا۔ تاہم اس نے اسے اپنے رسولوں کے زمرہ میں داخل کرلیا۔ (متی ۱۰-۴) اور اخیر تک اپنے ساتھ رکھا۔ اس بات کا سمجھنا البتہ بہت مشکل ہے لیکن یہ دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہودا اگر اپنا دل سخت نہ کرتا تو توبہ کرسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کا رسولوں کے زمرہ میں داخل ہونا ہر زمانہ کی کلیسیا کی عبرت کے واسطے ضرور تھا۔ پھر مسیح نے صلیب پر کہا کہ "اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" (متی ۲۷-۴۶) اس کا بھید تو فی الحقیقت انہی کو معلوم ہوسکتا ہے جو اس کے کفارہ کو مانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ صرف نبی تھا تو بھی اس قول سے بے صبری ثابت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس نے خدا کو اپنا کہا۔ اگر وہ بالکل بیگناہ اور خدا کا کامل بندہ نہ ہوتا تو اسکی کچھ وجہ معلوم نہ ہوتی کہ اس نے یہ بات تعجب سے کیوں کہی ۔

مسیح کا ایک اور فعل ہے جسکو ہم اس مقام پر کچھ ذکر کرنیکے قابل نہیں سمجھتے۔ لیکن چونکہ بعض مسلمان لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں اس واسطے اس کا ذکر بالکل نہ کرنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ یہ ہے کہ مسیح نے پانی کو مے بنایا۔ (یوحنا ۲-۹ سے ۱۱ تک) لیکن کوئی آدمی جو اپنے خاص مذہب کے سبب شراب کے مطلق ناجائز ہونے کا قائل نہ ہوگا اس فعل کو عیب نہ سمجھیگا۔ نہ توریت میں اس رائے کی طرف کچھ اشارہ ہے اور زبور

نہ انجیل میں کہ شراب کا استعمال مطلق ناجائز ہے۔ قرآن نے جو مسیح سے چھ سو برس بعد اس کو ناجائز ٹھیرایا کوئی صاحب انصاف مسیح کو اس کے سبب گنہگار نہیں ٹھیرا سکتا۔ البتہ مستی بڑا گناہ ہے۔ اس واسطے بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ اُن کو اِس گناہ کے خوف کے سبب مناسب ہے کہ مطلق شراب نہ پئیں۔ لیکن جو اعتدال سے پیتا ہے وہ توریت اور زبور اور انجیل کی رو سے گنہگار نہیں ہے۔

۴۔ ایک اور اعتراض ہے جو بعض لوگوں کو سب سے زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسیح نے خود اپنی نیکی سے انکار کیا یعنی یہ کہا کہ تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ مرقس کے ۱۰۔ ۱۷ اور ۱۸ کو دیکھو۔ لیکن مسیح نے جس سے یہ فرمایا وہ جوان اپنے اخلاقی حال سے بالکل خوش اور مطمئن ہوکر مسیح کے پاس آیا تھا۔ اور نہ بدی کا بھید جانتا تھا نہ نیکی کا۔ جب اُس نے اِس طرح بغیر سوچے نیکی کا ذکر کیا تو مسیح نے جواب میں اُس نیک ذات کا نام لیا جو اکیلا مطلق نیک ہے اور ساری نیکی کا سرچشمہ۔ چونکہ مسیح کی نیکی بھی آدمی کی نیکی تھی اس واسطے اِس نیکی کی بنیاد اسکی بشریت پر نہ تھی بلکہ وہ خدا ہی کی مقاربت سے ہمیشہ قائم رہی۔

ف ۱ ہاں بنی اسرائیل میں ایک قسم کے لوگ تھے جو نذر کی منت مانتے تھے اور البتہ اُنکے واسطے شراب مطلق ممنوع تھی۔ گنتی کے چھٹے باب کو دیکھو۔ لیکن توریت میں اور کسی قسم کے لوگوں کے واسطے ایسا حکم نہیں ہے۔

گیارھواں باب

مسیح کی بےگناہی کے نتائج

جب یہ ثابت ہو چکا کہ ایک بالکل بیگناہ آدمی اس دنیا میں گزرا ہے تو ضرور ہے کہ ایسا بڑا واقعہ لاحاصل نہ ہو۔ بلکہ ضرور اس سے بہت بڑے نتیجے نکلنے چاہئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور جو نتیجے نکلے وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کہ خود مسیح سے علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ہم سے علاقہ رکھتے ہیں ÷

ا۔ اول قسم کے نتیجے یہ ہیں ÷

(ا) پہلا نتیجہ یہ ہے کہ مسیح نے جو کچھ دین اور چال چلن کی نسبت فرمایا ہے اس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی بیگناہ ہو کہ ہم میں سے ہے اور پھر جب تاکید کے ساتھ دینی باتوں کی ہدایت کرے تو غلطی کر سکے۔ بلکہ اگر ہم کو یہ معلوم ہو کہ ایک آدمی بیگناہ ہے اور پھر بھی دینی باتوں کی غلط ہدایت کرتا ہے۔ تو ضرور ہم کو یا اُسکی بیگناہی میں شک ہو گا۔ یا اُسکی ہدایت کی غلطی میں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہم از خود جانتے ہیں کہ دینی باتوں میں جو نادانی اور غلطی ہوتی ہے وہ دل کی تاریکی کے سبب ہوتی ہے۔ یعنی اس سبب سے کہ گناہ دل پر کم و بیش چھایا ہوا ہوتا ہے ÷

(ب) دوسرے جب مسیح بیگناہ ٹھہرا تو اُس کا ٹھیک بڑے معجزے کا

کچھ جائے تعجب نہیں۔ جو لوگ معجزوں کو غیر ممکن سمجھتے ہیں اُن سے تو اس مقام میں کچھ بحث نہیں۔ کیونکہ وہ نہ بیگناہی کا امکان مانتے ہیں۔ نہ گناہ کا بھید جانتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ایک زندہ خدا کو مانتے ہیں اُنکو یہ بھی ماننا ضرور ہے کہ معجزوں کا وقوع بشرطیکہ وہ مناسب موقع پر ہوں جائے تعجب ورکنار۔ بالکل لازم اور واجب ہے۔ اور پھر اس وجہ سے یہ بھی ماننا ہوگا کہ اگر کوئی بیگناہ آدمی کبھی گذرا ہے تو خدا نے خاص اُسی کے وسیلہ سے بڑے بڑے معجزے دکھائے ہونگے۔ کیونکہ بنی آدم کی اس خراب حالی میں جو آپ ہے ایک بیگناہ آدمی کا ظہور خود ایسا بڑا معجزہ ہے کہ تجسم[ل] کے سوا اور کوئی معجزہ اُس سے بڑا کبھی نہیں ہؤا۔ پس جب بشریت کا سلسلہ ایسے بڑے معجزہ سے توڑا گیا تو کچھ بڑی بات نہیں کہ وہ بیگناہ آدمی دنیا کے معمولی قوانین قدرت کے سلسلے کو بھی توڑ سکے۔ اور وہ دنیا کی اس حکومت کا کچھ نشان دکھائے جو آدمی کی خاص خلقت کے سبب آدمی کا حق ہے (پیدائش ۱-۲۸ اور زبور ۸-۶ سے ۸ تک) کیا وہ بھی اُن قاعدوں کا پابند رہے گا جن کے ہم اپنی خستہ حالی سے پابند ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسی واسطے انجیل میں جیسا مسیح کی تعلیم کا یہ بیان ہے کہ وہ اور سب مرشدوں کی نسبت زیادہ اختیار اور یقین کے ساتھ تعلیم دیتا تھا۔ ویسا ہی اُسکی قدرت کا بھی یہ بیان ہے کہ وہ اور سب نبیوں سے زیادہ معجزے دکھاتا تھا۔ ہاں اگر اُس کا کوئی معجزہ اسکی بیگناہی کے برخلاف ہوتا۔

ل یعنی یہ عقیدہ کہ خدا مجسم ہو کر مسیح کی صورت میں ظاہر ہؤا۔

مثلاً اگر اُس نے کوئی معجزہ صرف اپنی قدرت دکھلانے کے واسطے یا اپنے کسی دشمن کا نقصان کرنے یا اپنا آرام حاصل کرنے کے لیئے دکھایا ہوتا۔ تو ایسے معجزہ سے اُسکی بیگناہی کا عقیدہ ردّ ہو جاتا۔ لیکن برعکس اِس کے مسیح کے سب معجزے اَوروں کے فائدہ یا روحانی تعلیم کے واسطے وقوع میں آئے بلکہ اُس نے کوئی معجزہ اپنی جسمانی ضروریات کے رفع کرنے کے واسطے بھی نہیں دکھایا۔

(ج) تیسرا نتیجہ فی الحقیقت پہلے نتیجہ میں شامل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب مسیح بیگناہ تھا تو جو کچھ اُس نے اپنی نسبت کہا گو پوری طرح وہ ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو پھر بھی اُسے قبول کرنا چاہئے۔ جب ہم اس کی طرف کامل نیکی منسوب کرتے ہیں تو وہ اپنے حق میں کسی طرح کی گواہی کیوں نہ دے ہم اس کو جھٹلا نہیں سکیں گے۔ اور جو لوگ کسیقدر بھی غور سے انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں اُن پر بخوبی روشن ہے کہ مسیح ہر جگہ اپنے تئیں اَور سب سے اعلیٰ اور مُقدّم کہتا ہے۔ اور یہ نہ صرف طبیعت یا مزاج کے اعتبار سے کہتا ہے۔ بلکہ فطرت یا ذات کے اعتبار سے بھی۔ وہ ہر جگہ اِس طرح اپنا ذکر کرتا ہے کہ مَیں باپ کے پاس سے آیا ہوں۔ مَیں آسمان سے اُترا ہوں۔ مَیں یہاں صرف ایک مدّت اور ایک خاص کام کے واسطے ٹھیرا ہوں۔ پھر اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں۔ ایسی ایسی باتوں سے ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ مسیح کی پیدائش اَور آدمیوں کی پیدائش کی طرح نہیں ہوئی۔ بلکہ خدا کی مخصوص قدرت سے ہوئی۔ جو لوگ یہہ نہیں

ماننے کہ مسیح کنواری سے پیدا ہوا اُن کو یہ بھی کہنا ہوگا کہ اُس کے ان اقوال میں بڑا مبالغہ ہے۔ لیکن چونکہ مسیح کی اکثر گفتار و رفتار میں مبالغہ ثابت نہیں ہوتا۔ اِس لئے یہ بات کچھ معقول نہ ہوگی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اَور آدمیوں میں ان کی پیدائش کے سبب ایک ایسا بُرا میلان پیدا ہوتا ہے کہ گو وہ خود گناہ میں شامل تو نہیں تاہم گناہ کا باعث ہوتا ہے۔ اور ہماری اخلاقی ترقی کو ایسا روک دیتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے دُرست نہیں ہوسکتی۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیگناہ آدمی کیواسطے یہی مناسب تھا کہ وہ اَور آدمیوں کی طرح پیدا نہ ہو۔

اس کے علاوہ مسیح نے اپنے حق میں جو گواہیاں دیں اُن سے نہ صرف اِس کا کنواری سے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ ایک اَور بہت بڑا نتیجہ بھی نکلتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ میں جو زمین پر ہوں آسمان پر بھی ہوں (یُوحنّا ۳-۱۳) اور پھر اپنے تئیں سارے آدمیوں کا مُنصِف ٹھہرا کر فرماتا ہے کہ "خدا نے عدالت کا سارا کام میرے سپرد کیا ہے" (یُوحنّا ۵-۲۲) پھر تمام جہان کے محنت اُٹھانے والے اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اپنے پاس بُلاتا ہے اور اُن کو آرام دینے کا وعدہ کرتا ہے (متی ۹ : ۲۸) پھر اپنے تئیں ہر ایک آدمی کے لئے والدین اور اولاد سے بھی زیادہ عزیز ٹھہراتا ہے (متی ۱۰-۳۵) پھر اس بات کا دعوےٰ کرتا ہے کہ سب آدمی مجھ پر ایمان لائیں اور مجھ پر توکل رکھیں اور میری خدمت اور اطاعت میں مصروف رہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ ہر ایک آدمی کی ابدی خوشی اور ابدی عذاب میرے ساتھ تعلق رکھنے پر موقوف ہوگا یعنی جیسا کوئی مجھ سے علاقہ رکھیگا ویسا وہاں پائے گا۔

(متی ۲۵ - ۳۴ سے الخ) ان باتوں سے خواہ مخواہ دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص یا تو سارے بزرگترین ہادیوں اور پاکترین آدمیوں اور جلیل ترین فرشتوں سے نہایت اعلیٰ اور مقدم تھا - یا معاذ اللہ ایسا گستاخ اور کافر اور خدا کا مخالف تھا کہ اور کوئی آدمی کبھی نہ ہوا ہوگا - بلکہ شاید اُس کو دیوانہ ہی کہنا ضرور ہوگا - لیکن جو کوئی انجیل کو صرف ایک مشہور کتاب سمجھ کر بھی پڑھے اس کو ایسا نتیجہ نکالنا غیر ممکن ہوگا - برعکس اس کے جو کوئی ایکبار اس عظیم ترین معجزہ کو مان لے کہ خدا مجسّم ہوا اُس پر یہ ساری باتیں بخوبی کھُل جاتی ہیں - یعنی یسوع کا چال چلن اور اُسکی تعلیم دونو یکساں اور موافق دکھائی دیتے ہیں اور یہ دونو تجسّم کے معجزہ کے ضروری نتیجہ معلوم ہوتے ہیں ۔

۲ - اب اُن نتیجوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہم سے علاقہ رکھتے ہیں -

(۱) جب مسیح بیگناہ ٹھہرا تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ہمارے لئے خدا کی ذات کا مظہر ہے - جو پیغمبر صرف خدا کے پیام کا پہنچانے والا ہو اُس کے واسطے تو بیگناہ ہی ضرور نہیں لیکن ہاں ایسا پیغام صرف ایک درجے تک خدا کی ذات کا مظہر ہوتا ہے - برعکس اس کے جب ایک بیگناہ آدمی خدا کی طرف سے آئے تو وہ نہ صرف خدا کی ذات کا مظہر ہوگا بلکہ خود اُس کا مظہر بھی ہوگا - بلکہ خدا کی ذات کا پورا ظہور ایسے ہی آدمی سے ہو سکتا ہے - چونکہ خدا ایک شخص[۵۵] ہے اِس واسطے اسکی ذات کا پورا ظہور

---

۵۵ علم الٰہیات کی اصطلاح میں لفظ شخص سے مُراد ہے اَلفرُدُ المتشخصُ المُعیّنُ یعنے ایسا فرد بالتقلِ وجود جس میں خود شناسی و خود مختاری پائی جاتی ہے ۔ (کشاف الاصطلاحات الفنون جلد اول صفحہ ۷۵۰)

نہ کتاب سے ہوسکتا ہے نہ اور کسی غیر ناطق چیز سے۔ بلکہ صرف ایک شخص سے ہوسکتا ہے۔ پس صرف ایک بےگناہ شخص خدا کی ذات کا پورا مظہر ہو سکتا ہے چنانچہ مسیح فرماتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا تو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دکھا" (یوحنا ۱۴-۹) خدا کی راستی پاکی محبت فضل۔ صبر۔ تحمل۔ سچائی۔ وفاداری۔ گناہ سے نفرت وغیرہ کا ایسا پختہ ثبوت ہم اور کہیں نہ پائینگے جیسا کہ یسوع مسیح کی گفتار و رفتار و موت اور جی اُٹھنے سے پاتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ اس کو جانتا تھا یعنی یوحنا رسول۔ اُس نے اُس کے حق میں لکھا ہے کہ اُس نے فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان خیمہ کیا . . . . . . خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اُسی نے ظاہر کیا" (یوحنا ۱-۱۴ و ۱۸)

(ب) پھر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بےگناہ آدمی نہ صرف خدا کی ذات بلکہ اُسکی مرضی کا بھی مظہر ہوگا یعنے وہ اور آدمیوں کے واسطے کامل نمونہ ہوگا۔ اور سب آدمی اُس کے نمونہ ہی پر چلنے سے خدا کو پسند آسکتے ہوں گے۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ چونکہ انسان کے تمام احوال مسیح پر نہیں گذرے۔ اس واسطے وہ تمام معاملوں میں انسان کے واسطے نمونہ نہیں ہوسکتا یہ تو آپ سے آپ ظاہر ہے کیونکہ ایک ہی آدمی کی عمر میں سب احوال نہیں گذر سکتے لیکن مسیح کے نمونہ پر چلنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کام ایسا کریں جیسا اُس نے کیا۔ اور اگر یہ مراد ہوتی تو سب آدمیوں کو مرشد بننا

بلکہ یہودیوں کی ساری باتیں اختیار کرنی بھی ضرور نہیں۔ لیکن اسکے یہ معنی ہیں کہ مسیح جس سبھاؤ سے اپنا ہر ایک کام کرتا تھا ہم لوگ اُسی سبھاؤ سے اپنا اپنا ہر ایک کام کریں۔ یعنی اسکے سبھاؤ ہی کے پیرو ہوں نہ کہ اُسکے سب ظاہری افعال کے۔ مگر پھر بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ اُس کے مرشد ہونے کے سوا۔ جو خاص سببوں سے ضرور تھا۔ اسکی تمام رفتار و گفتار ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانے اور ہر درجہ اور ہر حالت کے آدمیوں کی پیروی کے ایسی لائق ہے کہ اور کسی کی کبھی نہیں ہوئی۔ نہ ہندوستانیوں کو وہ اجنبی معلوم ہوتی ہے اور نہ انگریزوں کو۔ بلکہ جو قومیں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی نسبت یہودیوں سے بہت زیادہ دور اور جدا ہیں۔ اُن کو بھی وہ اجنبی نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ تمام جہان کے لوگوں کے لئے مسیح ایک عام نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اُس پر سب چل سکتے ہیں۔ اور جب سب چل سکتے ہیں تو سب کو چلنا واجب اور فرض بھی ہے۔

(ج) اِس کے علاوہ بے گناہ آدمی اَور آدمیوں کے واسطے نہ صرف خدا کی ذات اور مرضی کا مظہر ہوگا۔ بلکہ اُس نے جو گواہی اپنے حق میں دی ہے جب اُس کو مانتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وُہ اَور آدمیوں کا اُن کے گناہوں سے رہائی دینے والا بھی ہوگا۔ نہیں تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ بیگناہ آدمی کیوں دُکھ اُٹھائے اور مر جائے؟ اگر اُس کا دُکھ اور موت دوسرے شخص کیطرف سے ہوئی تو وہ دوسرا شخص بے انصاف ٹھہرتا ہے۔ اور اگر اس کی اپنی طرف سے ہوئی تو اُس کا اپنی زندگی کو جس سے اَوروں کو

بہت فائدہ پہنچتا تھا ترک کرنا ہی اسکی بیگناہی کا متناقض ہے - ایسے اعتراض کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ وہ جو دکھ اور موت میں مبتلا کیا گیا اور پھر اُسنے خود انہیں اختیار بھی کیا یہ گنہگاروں کی نجات ہی کے واسطے ہؤا - ورنہ جو سوال مسیح نے صلیب پر کیا کہ "اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے"؟ (متی ۲۷ - ۴۶) اس کا کچھ جواب نہ ہو سکتا - اس سوال کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ جو آدمی اس سوال کرنے کے وقت مرنے کو تھا وہ خدا بھی تھا اور اُس نے تمام بنی آدم سے ایسا علاقہ رکھا تھا کہ اُن کا پیشوا اور عوض ہو سکے اور اس طرح خود بیگناہ ہو کر بنی آدم کے گناہوں کے واسطے دکھ اٹھا سکے اور کفارہ ہو سکے - اگر اُسمیں ذرا بھی گناہ ہوتا تو اس کے تمام دکھوں سے اُسکے گناہ کا بھی کچھ کفارہ نہ ہو سکتا - لیکن چونکہ وہ بیگناہ تھا اسلئے اب ہم اسکی لاانتہا اذیتوں پر نظر کر کے اور یہ جانکر کہ وہ اُنکا کچھ بھی مستوجب نہ تھا اپنے گناہ کو اُسپر لدا ہؤا اور اُس کے خون سے دھویا ہؤا جان سکتے ہیں ؎

(د) یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسیح کے کفّارہ سے کسی کو خواہ مخواہ نجات نہیں ملتی - یہ نجات اُسی کو مل سکتی ہے جو مسیح سے میل رکھتا ہے - اور اس میل سے نہ صرف گناہ کی مغفرت ہوتی ہے - بلکہ نئی اور پاک زندگی شروع ہو جاتی ہے - اس نئی زندگی کا پہلا کام توبہ ہے - یعنی اپنے گناہ سے افسوس اور نفرت کر کے خدا کی طرف مڑنا - لیکن یہ توبہ اَور کسی وسیلے سے انسان کے دل میں اس قدر پیدا نہیں ہوتی جس قدر کہ بیگناہ مسیح کے

دکھ اُٹھانے اور مرنے پر غور کرنے سے ہوتی ہے۔ مسیح کے پاک چال چلن پر غور کرنے سے تو اپنی نیکی کی ایسی تحقیر اور اُسکی ترقی کی ایسی بڑی آرزو پیدا ہوتی ہے جیسی اور کسی وسیلے سے نہیں ہوتی۔ مگر جو کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ بیگناہ شخص میرے ہی گناہ کے سبب لاانتہا دکھ میں گرفتار ہو کر مر گیا۔ وہ بیشک اپنے گناہ سے اِس سے بھی زیادہ سخت نفرت کریگا اور اِس سے بالکل پاک ہونیکا آرزومند ہو گا۔

(ھ) لیکن مسیح نہ صرف ایسے ایسے خیالات کے وسیلے سے اپنے پیروؤں کو گناہ کے قبضے سے چھڑاتا ہے۔ بلکہ اپنی ذاتی تاثیر سے بھی ایسا کرتا ہے۔ جو لوگ اُس سے میل رکھتے ہیں وہ اُسکے ساتھ مرتے اور جی اُٹھتے ہیں۔ وہ اُن کے لئے نئی زندگی کی اصل اور دائمی سرچشمہ ہوتا ہے۔ اُس کی بیگناہی نہ صرف ہماری طرف منسوب ہوتی ہے بلکہ ہمکو رفتہ رفتہ زیادہ حاصل بھی ہوتی جاتی ہے۔ ہماری پرانی انسانیت تو گناہ آلودہ رہتی ہے۔ لیکن ایک نئی انسانیت جو گناہ سے پاک ہے ہم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پولوس کہتا ہے کہ "میں زندہ نہیں بلکہ اب مسیح مجھ میں زندہ ہے اور میں جو اب جسم میں زندہ ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے زندہ ہوں" گلاتیوں کے خط کے ۲-۲۰ کو دیکھو۔

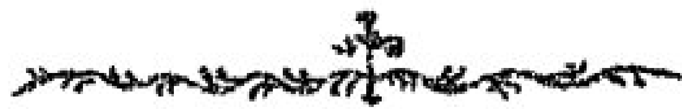
(و) اب یہ بیگناہ مسیح نہ صرف ایک ایک فرد بشر میں اپنی زندگانی اور اپنی بیگناہی کا اثر پیدا کرتا ہے۔ بلکہ اُس نے ایک جماعت بھی قائم کی ہے۔ جسمیں یہ بیگناہی اور زندگی ظاہر ہوتی ہے اور اِس جماعت کو

کلیسیا کہتے ہیں۔ چونکہ آدمی مُدنی الطبع ہے اس واسطے ایک اکیلا آدمی کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو پھر بھی جب تک کسی کامل جماعت میں شامل نہ ہو اُس کی کاملیت غیر ممکن ہوگی۔ دُنیا میں جماعتیں تو بیشمار طرح کی ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ آدمی کا خاص کام دینداری ہے اس لئے وہ جماعت اور سب جماعتوں سے مُقدّم ہوگی جس کا مقصودِ اصلی دینداری ہی ہو۔ پھر دینی جماعتیں بھی دُنیا میں بیشمار ہوئی ہیں لیکن وہی دینی جماعت سب سے مُقدّم ہوگی جس کو اُس آدمی نے قائم کیا ہو جو سب آدمیوں میں اکیلا بیگناہ تھا۔ بلکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ سب آدمیوں پر فرض ہے کہ اُسی جماعت میں شریک ہوں۔ ورنہ اُس بیگناہ شخص سے میل رکھنا ممکن نہ ہوگا ہاں چونکہ یہ جماعت ظاہری ہے اِس واسطے کچھ عجب نہیں کہ بہت سے ایسے لوگ بھی اُس میں پائے جائیں جو باطن میں اُس سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ مگر پھر بھی جو دل سے مسیح کے مُقلّد ہیں۔ اُن کو اُس میں شریک ہونا ضرور ہے ۔

(ف) لیکن کلیسیا کا یہ حال ہمیشہ نہیں رہ سکتا کہ اسمیں بُرے آدمی بھی شریک ہیں۔ بلکہ بیگناہ مسیح اُس کو آخرکار بالکل پاک صاف کریگا۔ جو آدمی بیگناہ ہے وہ بذاتہٖ غیر فانی بھی ہے۔ کیونکہ موت کا سبب گناہ ہی ہے پس جو بیگناہ ہے اُس پر کس طرح موت غالب رہ سکتی ہے؟ لیکن چونکہ وہ بنی آدم کا پیشوا بھی ہے اِس لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے ہی میں غیر فناپذیری رکھنے پر کفائت کرے۔ بلکہ ضرور ہے کہ وہ اُسے اپنے

سب پناہ گیروں کو جن میں وہ خود رہتا ہے عنایت کرے۔ لیکن صرف بقا آدمی کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ جو ہمیشہ کی زندگی اسکو چاہیئے وہ کامل زندگی ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی جتنے کمال کو پہنچ سکتا ہو وہ اُس کو حاصل ہو اور ہمیشہ حاصل رہے۔ پس یہ بھی بیگناہ منجی کا کام ہے کہ جو پاک زندگی وُہ اپنوں کو دیتا ہے اُسے کمال کو پہنچائے۔ یہاں تک کہ گناہ کا نام و نشان بھی اُن میں نہ رہے۔ اور اس کے علاوہ اپنی کلیسیا کو بھی کمال کو پہنچائے۔ یہاں تک کہ سب بدلوگ ہمیشہ کے لئے اس سے الگ کئے جائیں۔ یہی وہ اُمید ہے جو بائبل میں مذکور ہے یعنی جس طرح گناہ نے موت کے وسیلے سے بادشاہی کی اُسی طرح فضل بھی ہمارے خداوند یسوع مسیح کے سبب ہمیشہ کی زندگی کے لئے راستبازی کیطلے بادشاہی کرے۔" (رومیوں ۵-۲۱) +

اِس بیگناہ شخص سے جو گنہگاروں کو گناہ سے بچاتا ہے اُن لوگوں کا غافل رہنا غیر ممکن ہے جو اُس سے واقف ہو چکے ہوں۔ الغرض خدا نے ہمیں ہمیشہ کی زندگی بخشی اور یہ زندگی اُسکے بیٹے میں ہے جس کے پاس بیٹا ہے اسکے پاس زندگی ہے۔ اور جس کے پاس خدا کا بیٹا نہیں اُس کے پاس زندگی نہیں۔" (۱ یوحنا ۵-۱۱ و ۱۲) +



تتمّہ

مسیح کی بیگناہی کے عقیدہ کی تواریخ

حواریوں کو اور پہلی پشت کے مسیحیوں کو مسیح کی بیگناہی مسیحی دین میں ایسی بالضرور شامل معلوم ہوتی تھی کہ نہ کبھی اس میں شک پیدا ہوئے اور نہ کبھی دلیلوں سے اُس کو ثابت کیا گیا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ ہے کہ پہلے پہل جس نے اِس عقیدہ میں شک کیا وہ گنُوسٹک فرقے میں سے باسلدیس نامی ایک آدمی تھا جو دوسری صدی کے اول نصف میں گذرا ہے اُسکی یہ رائے تھی کہ ہر ایک آدمی اپنے دُکھوں سے اپنے گناہوں کا کفارہ دیتا ہے اور اس نے مسیح کی طرف بھی اُس کو منسوب کیا۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ مسیح نے کوئی گناہ کیا۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ معصوم تھا اور جس طرح بچّے کسی بُرے کام کے سبب دُکھ نہیں اُٹھاتے۔ بلکہ اپنے گناہ آلودہ میلان کے سبب اُٹھاتے ہیں۔ اسی طرح مسیح کا بھی حال تھا۔

جب گنوسٹکوں کی مخالفت کے سبب کلیسیا مسیح کی حقیقت و ماہیت پر زیادہ غور کرنے لگی تو اُسکی بیگناہی کا چرچا بھی شروع ہوا۔ یہ خاص کر ایرینئیس تُرتلین۔ کلیمنٹ۔ اُوریجن کے نوشتوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اِن میں اتنا فرق ہے کہ تُرتلین نے تو یہ سمجھا کہ مسیح کی بیگناہی اُسکی الوہیت کا ضروری نتیجہ ہے اور اُوریجن نے یہ سمجھا کہ مسیح کی انسانی رُوح اسی واسطے

الوہیت سے ملنے کے لائق ٹھیری کہ وہ بیگناہ تھی۔ کلیمنٹ مسیح کو آن مارتیتس یعنی بیگناہ نہیں کہتا بلکہ انے پے تھومیتس یعنی بےخواہش کہتا ہے۔ گناہ کے باب میں کلیمنٹ کی یہ غلط رائے تھی کہ جہاں خواہش ہوتی ہے وہاں گناہ بالضرور ہوتا ہے۔ اور اس کی اسی غلطی سے یہ لفظ پیدا ہؤا۔ مگر جب کلیمنٹ نے مسیح کو بے خواہش ٹھیرایا تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے مسیح کو بیگناہ بھی سمجھا ہوگا۔ پہلے پہل جنکی تصنیفات میں لفظ آن مارتیتس مسیح کے حق میں پایا جاتا ہے وہ ہپولیوتس ہے جو تیسری صدی کے اول نصف میں گذرا ہے +

اپُلی ناریُس نے جو چوتھی صدی کے وسط میں گذرا ہے اپنی خاص رائے کے ثبوت کے لئے مسیح کی بیگناہی پر تکیہ کیا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ پورا[۱] انسان بیگناہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انسان نیکی میں ترقی کرنے کی کوشش اور گناہ کے ساتھ جنگ کے بغیر کامل نہیں ہوسکتا۔ اور جہاں یہ ترقی اور جنگ ہوتی ہے وہاں گناہ کا ہونا بھی ضرور ہے۔ لیکن انسان کے نجات دہندہ کے لئے ضرور ہے کہ وہ گناہ سے بری ہو اور اس سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ اِس سبب سے مسیح پورا انسان نہ تھا۔ بلکہ اُس کی انسانی روح کے عوض اُس کی اُلوہیت کام کرتی تھی اور اُس کی قدرت سے وہ بیگناہ رہا +

اِس کا جواب اتاناسیس نے یہ دیا کہ اگرچہ گناہ اب سب آدمیوں

---

[۱] یعنی جس میں انسانیت کے تمام اجزا موجود ہوں مثلاً روح جسم وغیرہ +

میں پایا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ جزوء انسانیت نہیں ہے اور اس سبب سے ممکن تھا کہ مسیح پورا آدمی بھی ہو اور بیگناہ بھی ہو بلکہ یہ ضرور بھی تھا تاکہ وہ ہمکو دکھائے کہ ہم جو پورے انسان ہیں گناہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں ؂

کلیسیا کے جس مجمع میں پہلے پہل مسیح کی بیگناہی کا ذکر ہوا کل سدان کا مجمع ہے جو ۴۵۱ء میں ہوا تھا۔ اس میں یہ ٹھیرا کہ مسیح فی الحقیقت آدمی تھا۔ روح ناطق اور بدن سے بنا ہوا۔ اپنی آدمیت کے اعتبار سے ہمارا ہم جنس۔ اور گناہ کے سوا سب باتوں میں ہماری مانند" ؂

سخ لاسٹک[۱] معلموں نے بہت صاف صاف اور بڑی تاکید کے ساتھ مسیح کی بیگناہی کا اقرار کیا۔ لیکن وہ خاص کر اسی بات پر بحث کرتے تھے کہ آیا مسیح کے لئے گناہ کرنا ممکن تھا یا نہیں۔ اس باب میں پیٹر لمبارڈ کا یہ قول اکثر لوگوں نے منظور کیا کہ مسیح کی روح چونکہ الوہیت سے ملی ہوئی تھی۔ اس لئے گناہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہی روح اگر الوہیت سے ملی نہ ہوتی تو گناہ کر سکتی ؂

معلوم ہوتا ہے کہ قرون سخیکی لوگ جو بڑے شد و مد سے اس عقیدہ کے طرفدار تھے کہ مریم جب وقت سے اپنی ماں کے پیٹ میں پڑی بیگناہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ یہ سمجھے تھے کہ اس سے مسیح کی بیگناہی زیادہ ثابت ہوگی۔ مگر اس سے یہ بڑا نقصان ہوا کہ یا تو مسیح کے سوا ایک اور نجات

---

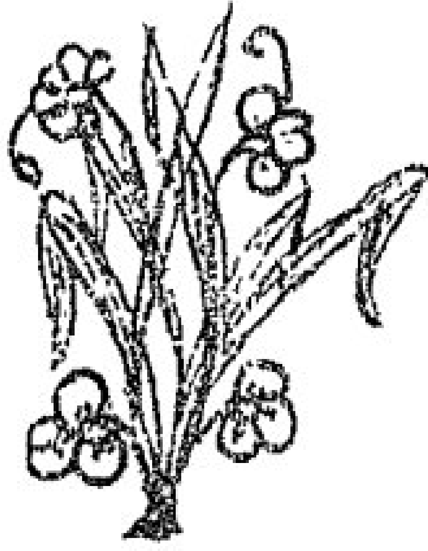
[۱] کلیسیا کے وہ معلم اس نام سے مشہور ہیں جو یورپ میں گیارھویں صدی سے پندرھویں تک گذرے ہیں۔

وہندہ ثابت ہوا یا یہ ثابت ہوا کہ بیگناہی اور نجات دہی دونو آپس میں لازم ملزوم کا علاقہ نہیں رکھتیں۔ رومی کلیسیا نے رفتہ رفتہ مریم کی بیگناہی کی رائے کو تسلیم کیا۔ یہاں تک کہ جب مریم کے نام کا ایسا استعمال ہو گیا جیسا کہ نجات دہندہ کے نام کا ہونا چاہیئے۔ تو آخر کار ۸ دسمبر ۱۸۵۴ء میں کلیسیا کے ضروری عقیدہ کے طور پر یہ ٹھہرایا گیا کہ مریم پیٹ میں پڑنے ہی کے وقت سے لیکر بیگناہ تھی +

چونکہ مریم اور اَور مقدسوں کی حد سے بڑھ کر تعظیم کرنے کے سبب مسیح کے سوا خدا اور انسان کے درمیان بہت سے شفیع قائم ہو گئے تھے۔ اِس لئے سولھویں صدی کے مصلحوں کا خاص کام یہی تھا کہ مسیحیوں کے خیالوں میں مسیح جس درجہ سے اُتارا گیا تھا پھر اُسی درجہ پر اُسے بحال کریں۔ اِس واسطے اُن کو بھی مسیح کی بیگناہی بدیہی بات معلوم ہوتی تھی پس اُنہوں نے اُس پر بحث نہیں کی۔ اُن کی دوسری پشت میں پھر یہ بحث شروع ہوئی۔ اور خاصکر اُنیسویں صدی میں اس عقیدہ کی نسبت بڑا مباحثہ ہوا ہے۔ بہت سے عالموں نے اِس عقیدہ کو ترک کیا اور ان میں سے بعض تو ڈی اسٹ ہیں جو مسیح کو محض آدمی مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ گناہ یا بقول اُن کے کمزوری ضرور شامل ہے۔ بعض پنتھی اسٹ ہیں جو بدی اور نیکی دونو کو دنیا کی اصلی فطرت کی ضروری صورتیں سمجھتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کے جواب میں بہت سی کتابیں خصوصاً جرمنی میں خاص اسی عقیدہ کے باب میں تصنیف ہوئیں۔ اُن کے مصنفوں میں

سے خاص کر شلے آرماخر کا نام لینا ضرور ہے جو ۱۷۶۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۴ء میں مرگیا۔ اِس کے بہت سے خیال نو خام تھے مگر اس سبب سے وہ دائمی تعریف کے قابل ہے کہ اُس نے مسیحی دین کی حقیقت کا یوں بیان کیا۔ کہ اُس میں دو خاص حقیقتوں کا ذکر ہے۔ یعنی گناہ اور فضل کا۔ اور فضل کا یہ عمل ہے کہ ایک بیگناہ نجات دہندہ کے تاثیر سے گناہ کا غلبہ دفع کیا جاتا ہے ۔

مذکورہ بالا کتابوں میں پروفیسر اُلمن صاحب کی کتاب مسمی یسوع کی بیگناہی خاص ذکر کے لائق ہے۔ اور اُسی کے بیان کی بنیاد پر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے ۔





مطبوعہ مسیحی پریس لاہور
۱۹۰۱ء